اپنی کم فہمی پہ جاتی ہی نہیں تیری نظر
یہ نہ سمجھا تھوپ دی قدرت نے اُس پر گمرہی
دیکھ اُس کی بے کسی، بیچارگی و اضطرار
رہنے دے اس راز کو شاعر کے سینے میں نہاں
آج غیر اللہ کے سجدے سے تو ناراض ہے
حکم جب تو نے دیا، اکبرؔ[3] کو سجدہ ہے روا
پائے انساں پر جھکا کرتا تھا جب انساں کا سر
حکمِ رب اس کو سمجھتا ہے تو پھر اے کم نگاہ
سجدۂ آدم کا پھر دنیا کو اذنِ عام دے
جھکنے دے انسان کے آگے جبیں انسان کی
عظمتِ آدم فرشتوں کے لئے مسجود تھی
خانقاہوں میں اذانِ سجدۂ تعظیم دے
"آدمی کو ہے روا سجدہ" کھلا اقرار کر
تو اگر اس رسم میں ترمیم کر سکتا نہیں
یہ تو پہلا کارنامہ، صرف تھاؔ[4] شیطان کا
باوجودِ امرِ رب جس نے نہ جھکنے دی جبیں

گمرہی کا بار رکھ دیتا ہے تو شیطان پر
وہ یہ کہتا ہی رہا "ربِّ[1] لِمَا اغویتنی"
اور پھر منشائے فطرت کا یہ جبر و اختیار
نصِّ "اِنّی اَعلَمُ[2]" کا تو کہاں ہے راز داں
تیرا ماضی، حال کا تیرے مگر ناقض ہے
کیا ترا زورِ شریعت اُن دنوں مفلوج تھا؟
کیا ترے فتووں پہ تھا اُس وقت تقوے کا اثر؟
سجدۂ تعظیم کو اب کر دیا ہے کیوں گناہ؟
جو نہ شیطاں کر سکا، اس کام کو انجام دے
جب مسلّم ہے کہ آدم سے بنا ہے آدمی
آدمی کو خیر سجدہ آدمی ہی کا سہی
اپنے دستورِ کہن کو جراتِ ترمیم دے
ورنہ پھر شیطان کی تعریض سے انکار کر
حق پرستی میں تری تسلیم کر سکتا نہیں
جس نے غیر اللہ کو سجدہ نہ آخر تک کیا
کیوں نہ کہیئے پھر اُسے وحدت پرستِ اولیں

اِس ترے انکار میں ابلیس کی تائید ہے
اے موحّد! یہ بھی تو شیطان کی تقلید ہے

ہے مقلّد جس کا، کہتا ہے اُسی کو راہزن
تیری گمراہی سے ہے شیطان کو کیا واسطا
تیرے دل میں خالصاً حق کی محبت ہی نہیں
تیرے کاروبارِ دنیاوی سے بے پروا ہے وہ
راہزن ہوتا، تو یہ آسان تھا اس کے لئے
حجِ کعبہ کے سفر کی توڑ دیتا ہمتیں
تجھ میں اُس میں فرق ہے لاریب صبح و شام کا
اپنے رب سے واسطہ اُس کا براہِ راست ہے
عقل، تیری اس ادا پر تنگ بھی حیراں بھی ہے

شرم کیوں آتی نہیں اے جانشینِ اہرمن!
وہ رقیب اُس دل کا ہے جس دل میں ہو عشقِ خدا
کیا کرے گا چور آکر، گھر میں دولت ہی نہیں
ہاں ترا دشمن ہے، لیکن دشمنِ دانا ہے وہ
بند کر دیتا وہ تیری مسجدوں کے راستے
مطلقاً ویراں پڑی رہتیں یہ تیری مسجدیں
تیرے دل میں ہے "خودی" اور اُسکے دل میں ہے "خدا"
اور تجھ پر منطبق "از ماست و بر ماست" ہے
منکرِ شیطاں بھی ہے تو، پیروِ شیطاں بھی ہے

گو موحد ہے، مگر کامل موحد بھی نہیں
تُو ابھی شیطان کا پورا مقلّد بھی نہیں

---

[1] اے رب مجھے کیوں گمراہ کرتا ہے؛ [2] انی اعلم ما لا تعلمون [3] جلال الدین محمد اکبر شہنشاہ ہند [4] الا ابلیس

دستنبوی غالب

(از جناب منشی مہیش پرشاد صاحب، ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ آف اردو، ہندو یونیورسٹی، بنارس)

۱۸۵۷ء میں مئی کے دوسرے ہفتہ میں ہندوستان میں غدر عظیم برپا ہوا۔ اس وقت مرزا کی عمر تقریباً ساٹھ سال کی تھی۔ اِس عمر میں وہ زمانے کا نشیب و فراز بہت کچھ دیکھ چکے تھے۔ چنانچہ مرزانے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی ایک مختصر روداد لکھی۔ اس میں صرف اپنی سرگزشت اور مشاہدۂ بیان سے کام رکھا اور نام اس کا دستنبو رکھا جس کا اظہار مرزا کے بہت سے خطوط میں ہے۔

بخوبی خیال رہے کہ یہ امر مبالغہ نہیں بلکہ بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ دستنبو کے متعلق جو عبارتیں مرزا کے خطوط میں پائی جاتی ہیں اِن سبھوں کو اکٹھا کر دیا جائے تو یقیناً ایک مستقل کتاب علیحدہ ضخامت میں اصل دستنبو سے بڑی بن سکتی ہے۔ لہٰذا محض نہایت ضروری اقتباسات ذیل میں دئے جائیں گے کیونکہ ڈر ہے کہ مضمون کی ضخامت اصل کتاب کے لحاظ سے کہیں زیادہ نہ ہو جائے۔

وجہ تصنیف

مرزا مورخ نہ تھے۔ وہ غدر کے ایام میں اپنے گھر کے اندر ہی رہے انھوں نے غدر میں حصہ بھی نہیں لیا تھا۔ پھر انھوں نے دستنبو کیوں لکھا۔ اِس کا جواب اُن کے ایک ہی خط سے مل جاتا ہے جس کو اُنھوں نے منشی ہرگوپال تفتہ[1] کے نام اُس وقت لکھا تھا جبکہ دستنبو کا مسودہ آگرہ میں چھپنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ چنانچہ اِس خط میں لکھا ہے:-

"صاحب، کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیسا جس میں میری جان اُلجھی ہوئی ہے اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلو تہی نہ کرو اور بدل توجہ فرماؤ۔"

صاف بات یہ ہے کہ مرزا کو انگریزوں کی طرف سے اُس وقت سے پنشن ملتی تھی جبکہ اُن کی عمر تقریباً ۹ سال کی تھی۔ چونکہ مرزا کے چچا نواب نصراللہ بیگ خاں انگریزی سرکار کے نوکر تھے۔ اُن کی وفات پر انگریزوں نے نواب صاحب کے متعلقین کی پنشن مقرر کر دی تھی۔ اور مرزا کو باسٹھ روپے آٹھ آنے ماہوار پنشن کے ملتے تھے جو کہ اپریل ۱۸۵۷ء تک مرزا کو برابر ملے تھے اور بعد کو یہ پنشن پھر برابر جاری ہو گئی تھی۔

غدر کے وقت میں دِلّی اور گرد و نواح کے بہت سے مسلمان نیز سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ بھی باغی ٹھہرائے گئے تھے۔ مرزا کا تعلق بادشاہ بہادر شاہ کے یہاں سے بہت زیادہ تھا اس لئے انگریزوں نے مرزا کو بھی باغی یا باغیوں کا طرفدار شمار کیا۔ چنانچہ اِن کی انگریزی پنشن بند ہو گئی تھی۔ بادشاہ بہادر شاہ کے یہاں کا سارا نقشہ بدل گیا تھا۔ پس بادشاہ سلامت کے یہاں سے جو کچھ ملتا تھا وہ بھی بند ہو گیا تھا علاوہ بریں اُن کی آمدنی کے دیگر ذرایع بھی مسدود ہو گئے تھے۔

قصہ کوتاہ وہ سخت مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ چنانچہ اپنی بریت، حصول پنشن اور حصول خلعت و دربار کی غرض سے مرزا نے دستنبو کو لکھا۔ میرے نزدیک مذکورہ بالا عبارت میں "جان اُلجھی ہوئی ہے" اور "بہت سے حصول مطالب" وغیرہ کی یہی اصل تفسیر ہے۔

مزید برآں یہ امر بھی مخفی نہ رہے کہ دستنبو میں جو کچھ مواد ہے وہ ایسا ہے اور ایسے پیرائے پر لکھا گیا ہے کہ جس سے مرزا کی بے گناہی ثابت ہو اور کسی قسم سے یہ بدگمانی نہ ہو کہ وہ انگریزوں کے بدخواہ یا کہ وہ باغیوں کے خیرخواہ رہے۔

وجہ تسمیہ کتاب

دستنبو لفظ ٹھیٹ فارسی زبان کا ہے اس کے معنی ہیں:- "سونگھنے کا گلدستہ یا تر میوہ جو سونگھا جائے۔"

چونکہ مرزا کا مقصد تھا کہ میں باغیوں کا چاپلوس نہ سمجھا جاؤں بلکہ انگریز کی نگاہ میں اچھا سمجھا جاؤں۔ چنانچہ اسی لئے اُنھوں نے اپنی روداد کا نام دستنبو رکھا تھا ورنہ کوئی اور وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مرزا اپنی ایسی کتاب کا نام دستنبو رکھتے جس میں کہ غدر کے حالات اور ذاتی مصائب کا بیان ہو۔

دستنبو کے باب میں کسی کا ایک لطف آمیز شعر یہ ہے:-

یار دستنبو بدستم داد و دستم بو گرفت
آنچہ دستنبو کہ دستم بو ز دستنبو گرفت

مرزا نے دستنبو کے آخر میں یہ لکھا ہے:-

این نامہ را پس از انجامیدن دستنبوے نام نہادہ آمد دست بدست و سوے بسوے فرستادہ آمد تا دانشوران را روان پرورد و سخن گستران را دل از دست برد امید کہ این دانشی دستنبوے بہ دست نیر دانیاں گلدستہ رنگ و بوے و در دیدہ اہرمن فشان آتشین گوے باد۔ تراج۔

زنبیان کہ ہمیشہ در روانی مائیم
سرچشمہ راز آسمانی مائیم
لختے ز دسا تیر بود نامہ ما
سامان شتم بہ کار دانی مائیم

گھبراہٹ اور عجلت

مرزا کے خطوط سے ہی ظاہر ہے کہ ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء کے بعد غدر سے تعلق رکھنے والے بہت سے واقعات مرزا کے مشاہدے میں آئے لیکن اُن کو مرزا نے قلمبند نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ مرزا گھبرا گئے تھے جیسا کہ میر مہدی حسین مجروح کو ایک خط[2] مورخہ ۸ر اگست ۱۸۵۸ء میں لکھا ہے:-

"صاحب، ہم نے گھبرا کر اس تحریر فارسی کو تمام کیا، دفتر بند کر دیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے ۱۵ مہینے کا حال لکھا اور آیندہ لکھنا موقوف کیا۔"

مرزا نے دستنبو میں ۱۵ مہینے کا جو حال لکھا ہے وہ بہت زیادہ نہیں ہے وہ اگر زیادہ لکھنے کے منتظر رہتے، حالات زیادہ لکھنے تو ممکن تھا کہ مرزا سے لغزشیں ہو جاتیں اور جن مطلب کے حصول کی غرض سے کتاب لکھی وہ مطالب فوت ہو جاتے اور موقع ہاتھ سے جاتا رہتا کیونکہ ۱۱ر جنوری ۱۸۵۸ء کو دِلّی سے مارشل لا اوٹھ گیا تھا اور اس کے بعد ہی دوسرے انتظامات شروع ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ پنشن داروں کے پنشن کی بابت انگریزی دفتر میں جانچ پڑتال ہو رہی تھی اور مرزا کے پنشن کی بابت بھی کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی تھی۔ جیسا کہ مرزا کے اُس خط[1] کے اقتباس سے ظاہر ہے جس کو کہ انھوں نے ۸ر اگست ۱۸۵۸ء کو میر مہدی حسین مجروح کے نام لکھا تھا:-

"پنشن کی صورت یہ ہے کہ کوتوال سے کیفیت طلب ہوئی۔ اُس نے اچھی لکھی۔ کل ہفتہ کا دن۔ ساتویں اگست کی۔ مجھ کو اجرٹن صاحب بہادر نے بلایا۔ کچھ سہل سوال مجھ سے کئے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے اور جلد ملے۔ تردّد اگر ہے تو اس میں ہے کہ ۱۵ مہینے پچھلے بھی ملتے ہیں یا صرف آیندہ کو مقرر ہوتی ہے۔"

خطوط غالب میں مرزا کا ایک خط نمبری ۴۴ بنام منشی ہرگوپال تفتہ ہے وہ غالباً ۷ر اور ۲۳ر اگست ۱۸۵۸ء کے درمیان کا ہے اُس میں مرزا نے دستنبو کے معاملے میں اہتمام اور عجلت کا حال یہ لکھا ہے:-

"چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اِس واسطے ہے کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا۔ اور ایک جلد بذریعہ ان کے جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو طرز تحریر کیا ہوگی۔ اور صاحبان مطبع کو اس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا۔"

دستنبو کے معاملے میں عجلت کی ایک وجہ بقول مرزا یہ بھی ہے کہ ایک صاحب نے اس کے چھپوانے کا قصد کیا لہٰذا یہ کام اُن کے سامنے ہی ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ میر مہدی حسین مجروح کو مرزا نے اپنے ایک خط[1] محررہ ماہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں اِس امر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے:-

"میاں، کیا باتیں کرتے ہو، میں کتابیں کہاں سے چھپواتا۔ روٹی کھانے کو نہیں شراب پینے کو نہیں۔ جاڑے آتے ہیں لحاف توشک کی فکر ہے۔ کتابیں کیا چھپواؤں گا۔ منشی امید سنگھ اندور والے دِلّی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست اُن کو میرے گھر لے آیا۔ اُنھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔ آگرہ میں میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا۔ اُس کو میں نے لکھا۔ اُس نے اس اہتمام کو اپنے ذمّہ لیا۔ مسودہ بھیجا گیا۔ ۸ر فی جلد قیمت ٹھہری۔ پچاس جلد بن منشی امید سنگھ نے لیں۔ پچیس روپیہ

---

[1] خط نمبر ۴۸ مورخہ ۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء (خطوط غالب جلد اوّل)

[2] خط نمبر ۲۸۶ (خطوط غالب)

[1] خط نمبر ۲۸۶ (خطوط غالب)

[1] خط نمبر ۲۸۸ (خطوط غالب)

جنگ کی گرانی میں پرانی گھڑیوں سے نئی کا کام لیجئے

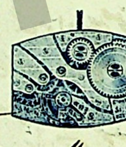

لیکن

ہر گھڑی ساز آپ کی مرضی کے مطابق کام نہیں کر سکتا

اس لئے

ہمارے ہاں آ کر ایک دفعہ تجربہ کیجئے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ مطمئن ہو جائینگے

کیونکہ

ہمارے ہاں مرمّت کا خاص انتظام ہے اور نہایت تجربہ کار اور معتبر گھڑی ساز کام کرتے ہیں۔ مناسب اُجرت اور وقت پر کام تیار کر کے دیتے ہیں۔ نیز نئے گھنٹے۔ گھڑیاں۔ ٹائم پیس وغیرہ کا بھی کافی ذخیرہ موجود ہے

نیو فرینڈز اینڈ کمپنی۔ چاندنی چوک۔ دہلی

معجون سیلان لوری

مستورات کے حسن و شباب اور صحت کا حقیقی محافظ

ہمارے ملک میں جس طرح مردوں میں جریان جہانگیر ہے اِسی طرح مستورات میں سیلان الرحم بھی عالمگیر ہے۔ یہ مرض بھی مثل جریان کے مہلک اعضاء رئیسہ و شریفہ اور خزانۂ منی و باہ کا دشمن ہے۔ بایں وجہ دماغ میں ضعف، خیالات میں انتشار، چہرہ پر بے رونقی، دل میں گھبراہٹ و کمزوری، بھوک میں کمی، جسم میں حرارت، لاغری اعضاء شکنی، سر، کمر، زانو اور پنڈلیوں میں درد۔ رنگ زرد۔ دست و پا میں لرزہ۔ کسی کام پر جی نہ لگنا اور تھوڑی سی محنت سے تھک جانا۔ سُستی و کاہلی کا حد سے بڑھ جانا۔ حمل کا قایم نہ رہنا۔ بصورت قیام حمل بچّہ کا لاغر و ناتواں پیدا ہو کر بہت جلد ضائع ہو جانا۔ جوانی کا پیری سے بدل جانا۔ حرارت کا قایم ہو کر دق کی صورت اختیار کر لینا۔ غرضیکہ اس کے پنجۂ ظلم میں پھنس کر بیچاریاں طرح طرح کے عجیب و غریب مصائب و امراض میں مبتلا ہی نہیں بلکہ ہزاروں حسرت و ارمان لیکر عین عالم شباب میں نذر اجل ہو جاتی ہیں۔

ہمنے محض ہمدردی و رفاہ عام کے لئے اِس معجون کو تیار کیا ہے جو اس بلائے ناگہانی سیلان الرحم کے دفع کرنے میں صدہا مرتبہ کامیاب بلکہ لاجواب ثابت ہوئی ہے۔ اس کا نسخہ بھی خاندانِ شریفی کا خاص نسخہ ہے جس کو عالیجناب حاجی حکیم محمد فاضل خاں صاحب رئیس اعظم دہلی نے بنظر رفاہ عام شمسی دواخانہ کو عطا فرمایا ہے۔ اسی خیال سے کہ سب خاص و عام مستفید ہوں نہایت ارزاں قیمت یعنی ۴ر (چار آنے) تولہ مقرر کی ہے۔ تیس خوراک کی شیشی تین روپے دو آنے (عہ) ترکیب استعمال یہ معجون چھ چھ ماشہ صبح و شام دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔

شمسی دواخانہ بازار بلیماران۔ دہلی

چھاپے خانے میں بطریق ہنڈوی بھجوا دئے۔ صاحب مطبع نے بشمول سعی منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ آگرے کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہئے ہے۔ حکام نے بکمال خوشی اجازت دی۔ پانسو جلد چھاپی جاتی ہے۔ اس پچاس جلد میں شاید پچیس جلد منشی امید سنگھ مجکو دیں گے۔ میں عزیزوں کو بانٹ دوں گا۔ پرسوں خط تفتہ کا آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں ایک فرمہ چھپنا باقی رہا ہے۔ یقین ہے کہ اسی اکتوبر میں قصہ تمام ہو جائے۔ بھائی میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے اکتیسویں جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمہ میں اس کی اطلاع دی ہے۔ امین الدین خاں کی جاگیر کے ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا۔ اُن کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔ منشی اُمید سنگھ اندور جانے والے تھے۔ اگر ختم کر کے مسودہ اُن کے سامنے آگرہ نہ بھیج دیتا تو پھر چھپواتا کون"؟

فارسی قدیم میں کیوں؟

مرزا نے، ۱۱ اگست ۱۸۵۸ء کے خط نمبر ۳ میں[۵] مرزا تفتہ کو لکھا ہے۔" اب ایک امر سنو۔ میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی و یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی ۱۵ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی فارسی قدیم میں لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس نثر میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام بدلے نہیں جاتے۔ وہ عربی۔ انگریزی۔ ہندی جو ہیں وہ لکھدئے ہیں۔ مثلاً تمھارا نام منشی ہرگوپال۔ منشی لفظ عربی ہے نہیں لکھا گیا اس کی جگہ شیوا زبان لکھدیا ہے"

خیال رہے کہ نظم سے مراد یہاں وہ اشعار ہیں جو کہ دستنبو کے متن میں متفرق طور سے آئے ہیں۔ اس سے وہ قصیدہ مراد نہیں ہو سکتا جو کہ دستنبو میں شامل ہے اور فارسی کے علاوہ عربی الفاظ پر بھی مشتمل ہے کیونکہ اس کی نسبت خود ہی مرزا نے خط نمبر ۳ بنام مرزا یوسف علی خاں عزیز میں یہ لکھا ہے:۔

" اور ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی و فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستائش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے"

مرزا نے اصل دستنبو کو فارسی قدیم میں لکھا ہے ممکن ہے کہ اس بات کا لگاؤ اس امر کے ساتھ ہو جو وجہ تصنیف کے متعلق کہا گیا ہے یعنی یہ کہ مرزا یہ جتلانا چاہتے تھے کہ میں بالکل علمی و ادبی آدمی ہوں۔ باغیانہ حرکت سے میرا کچھ لگاؤ نہیں خیر جو ہو سو ہو۔ مرزا نے دستنبو میں جو فارسی لکھی ہے اس کی بابت ایک خط[۱] میں منشی ہرگوپال تفتہ کو بھی لکھا ہے:۔

"اگر دستنبو کو سراسر غور سے دیکھو گے تو اپنا نام پاؤ گے اور یہ بھی جانو گے کہ وہ تحریر تمھاری اس تحریر سے سو برس پہلے کی ہے"۔

آگرہ میں کیوں چھپا ہوا

غدر کے بعد دہلی کے بہت سے کاروبار تباہ و برباد ہو گئے تھے۔ دہلی کے آباد ہونے کی نوبت بھی بہت دنوں کے بعد آئی تھی۔ پس مرزا نے اس کے چھپنے کا انتظام آگرہ میں کیا تھا کیونکہ اُس وقت دہلی میں مطبعوں کی جو کیفیت تھی اس کا اظہار مرزا ایک خط[۲] مرقومہ، ۱۱ اگست ۱۸۵۸ء میں یوں کرتے ہیں۔

یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں کہ ایک ہے اُس میں کاپی نگار خوشنویس نہیں ہے"۔

فارسی قصیدہ در تہنیت

مرزا نے ایک فارسی قصیدہ ستمبر ۱۸۵۸ء میں جناب ملکہ معظمہ کی تعریف میں لکھا۔ اُس میں فتح ہند کی مبارکباد لکھی اور اس کو دستنبو کے شروع میں شامل کرنے کا خیال بعد کو ہوا چنانچہ اس کے متعلق پہلے مرزا حاتم علی بیگ مہر[۳] کو لکھا۔

"ہاں صاحب ایک بات اور ہے اور وہ محل غور ہے۔ میں نے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے' تہنیت فتح اور عملداری شاہی ساٹھ بیت ہے۔ منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ ایک اور کاغذ مذہب پر لکھ کر بھیجوں۔ پھر خیال میں آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی گئی ہے یہ یعنی چھاپا ہوئی اگر یہ چھ صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز میں شامل جلد ہو جائیں تو بات اچھی ہے آپ اور منشی نبی بخش صاحب اور مرزا تفتہ۔ منشی شیو نراین صاحب سے کہہ کر اس کا طور درست کریں۔ اور پھر مجھکو اطلاع دیں تو میں مسودہ آپ کے پاس بھیجدوں۔ جب کتاب چھپ چکے تو چھپ جائے۔ دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ چھپے بعد کتاب کے اور لگایا جائے پہلے کتاب سے۔ دوسرے یہ کہ اُس کی سیاہ قلم کی لوح الگ ہو اور پہلے صفحہ پر جس طرح کتاب کا نام چھاپتے ہیں اس طرح یہ بھی چھاپا جائے کہ قصیدہ در مدح جناب ملکہ انگلستان خلد اللہ ملکہا۔ میرا نام کچھ ضرور نہیں کتاب کے پہلے صفحہ پر تو ہوگا"۔

قصیدے کے باب میں اس کے سوا ظریفانہ انداز میں منشی نبی بخش حقیر[۴] کو یہ لکھا:۔

"بھائی جان" میں نے ایک قصیدہ جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی مدح میں لکھا ہے۔ ساٹھ شعر ہیں۔ چھ صفحہ یعنی تین ورق پر چھپ کر دستنبو سے پہلے شیرازہ میں شامل کر دئے جائیں تو کتاب کو قصیدہ سے عزت اور قصیدہ کو کتاب کے سبب سے شہرت ہو جائیگی کل جناب مرزا صاحب کو یہ خط لکھ چکا ہوں یقین ہے کہ وہ آپ سے کہیں گے اور آپ مرزا صاحب اور مرزا تفتہ اور منشی شیو نرائن صاحب اس خواہش کو منظور اور اس قاعدہ کو

---

[۱] مطابق خطوط غالب

[۲] مرزا کے ایام میں عام دستور یہ تھا کہ کتاب کے شروع میں لوگ حمد و نعت لکھا کرتے تھے۔ مرزا کی کتابوں میں حمد و نعت نہیں صرف بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ضرور ہے۔ لیکن دستنبو میں یہ بھی نہیں کیونکہ اس سے عربی کا شمول ہو جاتا اور کتاب اس شعر سے شروع ہے:۔

بنام خداوند پیروزگر
مہ و مہر ساز شب و روزگر

[۳] خط نمبر ۴ مورخہ ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء (خطوط غالب)

[۱] خطوط بنام میر مہدی حسین مجروح مورخہ ۲ فروری ۱۸۵۹ء اور ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء۔ خط بنام سید یوسف مرزا مورخہ ۱۰ اگست ۱۸۵۹ء (خطوط غالب)

[۲] بنام منشی ہرگوپال تفتہ (خطوط غالب)

[۳] خط مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۵۸ء (خطوط غالب)

[۴] خط مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء۔

مقبول کرینگے اور جب باتفاق تم چاروں صاحب پسند کرو گے تو گویا باجلاس کونسل اس قانون کا اجرا منظور ہو جائیگا اور اُمیدوار ہوں کہ اجرائے قانون سے پہلے مجکو منظوری کی اطلاع ہو جائے تاکہ مسودہ اِس قصیدہ کا بھیجدوں۔ مہتمم مطبع کو اگر کچھ تامل ہو تو ہو ورنہ بات آسان ہے"

مرزا کی جیسی خواہش تھی اُسی طرح قصیدہ چھپا اور دستنبو کے شروع میں شامل ہوا ہے۔ لیکن یہ امر مخفی نہ رہے کہ دستنبو کے بعد کے اڈیشنوں میں قصیدے کو آخیر میں شامل کیا گیا ہے۔ پہلے اڈیشن میں قصیدے سے تعلق رکھنے والا پہلا صفحہ صرف قصیدے کے عنوان والی عبارت کے لئے وقف ہے اور وہ اس صورت میں مندرج ہے:۔

قصیدہ برگزیدہ

در مدح خداوند روئے زمیں سایہ جہاں آفریں۔
حضرت قدر قدرت ملکہ معظمہ انگلستان خلد اللہ ملکہ۔
بالعدل والاحسان۔
مشتمل بر تہنیت فتح
ہندستان[۱]۔

مرزا جب کہ دستنبو کا مسودہ آگرے بھیج چکے تھے تو تہنیت کے علاوہ بعض اور عبارتوں کو دستنبو میں داخل کرنے کے لئے منشی ہرگوپال تفتہ[۲] اور منشی شیو نراین[۳] کو لکھا تھا۔ القصہ دستنبو کے معاملے میں مرزا نے بے حد دلچسپی لی تھی پس ادبی حیثیت سے اس کتاب کی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

مزین جلدیں

مرزا نے دستنبو کی سات جلدوں کو خاص طور سے مزین کرایا اور ان کی تیاری میں بارہ روپے صرف کئے۔ ان میں سے تین کی لوحیں زریں اور چار کی لوحیں سیاہ قسم کی ہوئیں اگرچہ مرزا کی خواہش یہ تھی کہ دو کی لوحیں زریں پانچ کی سیاہ قلم کی ہوں[۱]۔ اِن جلدوں کو مرزا نے انگلستان اور ہندوستان کے حکام بالا کی خدمت میں بھیجا[۲] جس سے اُن کو بہت فائدہ ہوا۔

خاتمہ میں اشتہار

مرزا کی خواہش تھی کہ دستنبو کے آخر میں یہ عبارت چھاپی جائے[۳] "نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگزشت کی داستان ہے اس کو میں نے مطبع مفید خلایق میں چھپوایا ہے اور میری رائے میں اس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبان مطابع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں اپنے مطبع میں اِس کے چھاپنے پر جرأت نہ کریں۔

علاوہ بریں مرزا نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا:۔

"اسکے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور ہو تو منشی شیو نرائن کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔

القصہ اسی تحریر کا ثمرہ ہے کہ دستنبو کے آخیر میں یہ عبارت درج کی گئی تھی:۔

"اس کتاب کو بغیر اجازت مہتمم مفید خلایق کے کوئی صاحب چھاپنے کا ارادہ نہ کریں فقط"

---

[۱] ہندستان بلا واو درج ہے۔ [۲] خطوط مورخہ ۲۸ اگست و ۳ ستمبر ۱۸۵۸ء

[۳] خط مورخہ ۳ ستمبر ۱۸۵۸ء

[۱] خط محررہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر۔ [۲] خطوط بنام خواجہ غوث بیخبر مورخہ ۲ دسمبر ۱۸۵۸ء لغایتہ ۳۱ جنوری ۱۸۵۹ء۔ [۳] بنام منشی ہرگوپال تفتہ نمبر ۹۴ محررہ ستمبر ۱۸۵۸ء۔

آپکے مضبوط اور طاقتور جسم میں
قابل فخر دماغ

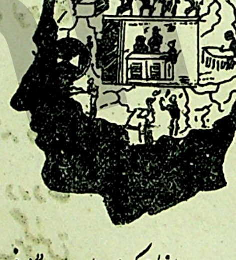

دماغ عام جسمانی طاقت کا محتاج ہے۔ اگر جسم میں طاقت نہیں ہوگی تو دماغ کو بھی غذا نہیں مل سکتی۔ اس لئے دماغ کو بہتر بنانے کیلئے ہمدرد دواخانہ کی لاجواب دوا "مفرح مشکیں" استعمال کیجئے۔ مفرح مشکیں جسم میں نئی زندگی پیدا کر کے دماغ میں برقی رو دوڑا دیتی ہے۔ حافظہ کو بہتر بناتی ہے۔ دماغی کام کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ معدہ میں پہنچتے ہی دماغ اور تمام اعصاب پر اثر کرتی ہے۔ دورانِ خون کو درست اور غذا کی خواہش کو تیز کر دیتی ہے۔ تمام دن کا تھکا ہوا دماغ اس کے اثر سے ازسرنو تازہ ہو جاتا ہے۔ کمزوروں کیلئے اور دماغی کام کرنے والوں کے لئے لاجواب ہے قیمت فی شیشی ۲ اخوراک ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

ہمدرد دواخانہ یونانی۔ دہلی

بندر کے غدود جسم میں داخل نہ کرائیے
اس کے بغیر بھی آپ ازسرنو جوان اور تندرست بن سکتے ہیں

ہزاروں روپے خرچ کر کے اور آپریشن کی تکلیف برداشت کرنے کے باوجود ازسرنو جوان نہ بن سکے اسکی وجہ یہ ہے کہ جوان بننے کے لئے غدودوں سے کہیں زیادہ نئے اور کافی خون کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ جدید طریقہ علاج سے یہ دریافت ہوا ہے کہ اب غدود کو تقویت دینے کے ساتھ جسم میں نیا خون بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور اس جدید علاج کی دریافت کا سہرا ہمدرد دواخانہ کے سر ہے جس نے اطبا کے ایک بورڈ کو مقرر کر کے شربت اکسیر خاص تیار کرایا ہے۔ یہ خوش ذائقہ مرکب حلق سے اترتے ہی خون بن جاتا ہے۔ اور غدودوں کو بھی تقویت دیتا ہے۔ اس کے استعمال سے اس قدر خون پیدا ہوتا ہے کہ بوڑھے بھی ازسرنو جوانی کی علامتیں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ دل دماغ۔ جگر اور معدہ کو قوی کرتا ہے اور قوت باہ بڑھاتا ہے۔ جسم کی کمزوریوں کو دور کر کے نئی طاقت سے جسم کو بھرپور کر دیتا ہے

جوانوں کی طرح جسم کے اندر مستعدی پیدا ہو جاتی ہے۔ بیس دن کے اندر صورت بدل جاتی ہے۔
قیمت فی شیشی ایکروپیہ آٹھ آنے

ہمدرد دواخانہ لال کنواں دہلی

غالبؔ

(از جناب نہال سیوہاروی)

ایکہ تو ہنگامہ سازِ گرمیٔ آواز تھا
ایک عالم جس سے گونج اُٹھا وہ تیرا ساز تھا

تھا جو تنگِ فکرِ اندازِ کہن تیرے لئے
اک نئی پیدا ہوئی طرزِ سخن تیرے لئے

جزو میں کل انجمن آرا نظر آیا تجھے
یعنی ہر قطرے میں اک دریا نظر آیا تجھے

یہ ہوا معلوم تیری رفعتِ تخیئل سے
نطقِ شاعر ہمنوا ہوتا ہے یوں جبریل سے

مرتبے بالا ہوئے خلقت سے تیری فرش کے
باز تھے تیرے تخیّل پہ دریچے عرش کے

جو ترے شایانِ شاں ہو بے گماں کہئیے تجھے
زیب دیتا ہے جو معنی کا جہاں کہئیے تجھے

کم نظر سمجھا کئے الفاظ کی جادوگری
تھی مگر مسلک میں تیرے شاعری پیغمبری

کس قدر ہشیار تیرا عالم رندانہ تھا
لب پہ پیغامِ عمل تھا ہاتھ میں پیمانہ تھا

تو وہ تھا میخانہ عالم میں مستِ جامِ عشق
ہر بنِ مُو تھا ترا مصروفِ وردِ نامِ عشق

عشق کیا ہے خلق کو پیغام ہے توحید کا
دوسرے الفاظ میں یہ نام ہے توحید کا

بلبلِ ہندوستاں اے گوئٹے کے ہمنوا
تو نہیں زندہ مگر پیغام ہے زندہ ترا

تیرے اندازِ نگارش سے نمایاں درد تھا
یوں دمِ تقریر تو گوہر فشانِ درد تھا

"سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں"

عہدِ سابق سے زیادہ آج تو مشہور ہے
تیری صہبائے سخن سے کل جہاں مخمور ہے

تیرا ممنونِ کرم ہے گلستانِ ریختہ
بڑھ گئی برگ و ثمر سے تیرے شانِ ریختہ

فخر ہے گر نغمۂ خیام پر ایران کو
تیرا دیواں مایۂ نازش ہے ہندستاں کو

تیرے سوزِ نغمہ سے ہے گرم سازِ ایشیا
ہند ہی کیا بلکہ تو ہے وجہِ نازِ ایشیا

وسعتِ آفاق پر ہے آج تو چھایا ہوا
حال مستقبل میں نکلا تیرا فرمایا ہوا

شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن
این مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

محمد تغلق کی سیرت

(از جناب پروفیسر آغا مہدی حسین صاحب ایم اے، پی، ایچ، ڈی، ڈی لٹ)

ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں سلطان محمد تغلق کی سیرت رہ رہ کر بیان کی ہے، اس کا حال چار دفعہ متواتر لکھا ہے، مگر تھوڑا تھوڑا سا۔ ہم نے چاروں عبارتوں کو جمع کر کے ایک ساتھ مطالعہ کیا اور ایک عبارت کا دوسری عبارت سے مقابلہ کیا تو ضیاء الدین برنی کا یہ قول نظر آیا، سلطان محمد تغلق ایک غیر معمولی شخصیت رکھتا تھا۔ اس میں حیرت انگیز صفتیں جمع تھیں جن کو سمجھنے سے میں قاصر رہا[1]۔ اس کا حوصلہ بے نظیر تھا۔ اس کی رگ رگ میں سرداری اور جہانگیری کی اُمنگیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے رونگٹے رونگٹے سے دنیا کے بڑے بڑے اور عظیم الشان بادشاہوں کی شان ٹپکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب تک وہ ساری دنیا کو فتح نہ کرلے گا اور تمام آدمیوں ہی کو نہیں بلکہ جنوں کو بھی قابو میں نہ لے آئے گا اُس وقت تک اُسے چین نہ آئے گا۔ لڑکپن ہی میں حضرت سلیمانؑ اور سکندر اعظم کی طرح سلطنت کرنے کی آرزو اُس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی، اور اچھی باتوں کی طرف اس کا رجحان ہو گیا تھا۔ سمجھ بَلا کی تھی۔ عقل بڑی تیز تھی۔ طبیعت بہت بردبار اور حلیم تھی۔ فوج کشی کے اصول اور فتح یابی کے طریقے اُسے خوب یاد تھے۔ اسی زمانے میں کمال حاصل کرنے کی آرزوئیں اور یکتا و بے ہمتا بننے کی خواہشیں اس کے دل میں پیدا ہوگئیں۔ چاہتا تھا کہ میں نبیوں کی طرح دین اور دنیا کے کل معاملات پر حاوی ہو جاؤں۔ بادشاہ نہیں بلکہ پیغمبر بھی بن جاؤں، انسانوں ہی پر نہیں بلکہ جنوں پر بھی حکومت کروں۔ ملک ملک کے بادشاہ میرے سامنے گردنیں جھکائیں۔ جوان ہوا تو اُس کے حوصلے اور بڑھے، اور وہ بلند خیالی اور عالی ہمتی کا مجسمہ سا بن گیا۔ بڑھاپا آیا تو بھی اُس کے حوصلے کم نہ ہوئے اور اُس کی بلند خیالیوں میں فرق نہ آیا۔ مختصر یہ کہ سلطان محمد تغلق کے رنگ ڈھنگ ہر حال میں یا تو سکندر اعظم کے سے تھے جو دنیا میں سب سے بڑا فاتح گزرا ہے اور یا حضرت سلیمانؑ جیسے۔ جو دین دنیا کے سردار اور انسانوں اور جنوں کے بادشاہ تھے۔ گویا قدرت نے بادشاہت اور سیادت اسی کے لئے بنائی تھی۔ سلطان محمد تغلق کی عالی ہمتی کو دیکھ دیکھ کر میں حیران رہ جاتا۔ اگر میں اس کی عالی ہمتی کو فرعون اور نمرود کی سی عالی ہمتی کہوں تو ممکن نہیں۔ اس لئے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھے تھے۔ قابلیت اُن میں نام کو نہ تھی، اور دعوے کے سوا انھیں کچھ آتا بھی نہ تھا۔ لیکن سلطان محمد تغلق عبادت میں مصروف رہتا تھا اور خدا کی بندگی میں لگا رہتا تھا۔ پانچوں وقت نماز پڑھتا تھا۔ اسلام کا بڑا معتقد تھا۔ اگر میں اس کی عالی ہمتی کو بایزید بسطامیؒ کی سی بتاؤں جو خدا میں جذب ہو گیا تھا اور خودی کو بھول گیا تھا اور سبحانی ما اعظم شانی (میں پاک ہوں اور میری کتنی بڑی شان ہے!) کہا کرتا تھا۔ یا حسین منصور حلاج کی سی بتاؤں جو جیتے جی مر مٹا تھا اور انا الحق (میں خدا ہوں) کہا کرتا تھا تو یہ بھی ممکن نہیں۔ سلطان محمد تغلق کو مسلمانوں۔ سیدوں۔ صوفیوں۔ عالموں، سُنیّوں، مولویوں اور شریفوں کا خون بہانے کی عادت تھی۔ اس وجہ سے میں اس کو بایزید بسطامی اور حسین منصور حلاج کے مانند بھی نہیں لکھ سکتا۔ بس یہی لکھ سکتا ہوں کہ خدا نے سلطان کو عجیب چیز بنایا تھا۔ اُس میں ایسی متضاد صفتیں تھیں جن کا سمجھنا ممکن نہیں اور سمجھنا تو درکنار رہیں تو اُن کا تصور ہی کرنے میں حیران رہ جاتا ہوں۔ ایسا شخص جس کے باپ دادا مسلمان ہوں، جو خود مسلمان ہو، نماز گزار ہو، شریعت کا پابند ہو۔ نہ کسی قسم کا نشہ کرتا ہو، نہ کبھی کسی بُری بات کی طرف مائل ہوتا ہو۔ زنا سے۔ بدفعلی سے۔ حرام کاری سے۔ خیانت سے، جوئے سے، فسق و فجور سے کوسوں دُور رہتا ہو، وہ سچّے مسلمانوں کا اور سچّے مومنوں کا خون پانی کی طرح بہایا کرے تو اُسے کیا کہا جائے؟ ایسے ایسے پائے کے عالم جن کے خون کا ایک ایک قطرہ خدا کے نزدیک ساری کائنات سے بڑھ کر تھا سلطان محمد تغلق نے بے خوف و خطر تلوار سے کٹوا ڈالے۔ مسلمانوں۔ مومنوں اور عالموں کا خون بہانے کی دُھن میں وہ نہ قرآن کی پرواہ کرتا تھا نہ حدیث کی۔ اس پر بھی وہ عبادت میں مصروف رہتا۔ پانچوں وقت کی نماز پابندی سے پڑھتا۔ جمعہ اور جماعت کی نمازوں میں بھی شریک ہوتا۔ بد اخلاقیوں سے بھی بچتا رہتا اور بدفعلیوں کے پاس بھی نہ جاتا۔ خلیفہ عباسی کا اتنا معتقد تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہ کرتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں سلطان محمد تغلق کا کونسا وصف بیان کروں۔ اور اس کی کس صفت پر اس کی سیرت کا اندازہ کروں۔ اگر اس کی عطا و سخا کا۔ اس کے انعام و اکرام کا اور ایثار کا حال لکھوں تو کئی جلدیں درکار ہوں۔ بلند خیالیوں کو تحریر کروں تو کئی کتابیں بنیں۔ اسکی سخاوتوں اور بخششوں کی کوئی حد نہ تھی۔ خزانے کے خزانے چاہتا جسے دیدیتا۔ آدمی نیا ہو یا پُرانا امیر ہو یا فقیر۔ مسافر ہو یا رئیس، سلطان محمد تغلق پہلی ہی ملاقات میں دیتا اور سوال کرنے سے پہلے دیتا۔ اور اتنا دیدیتا کہ لینے والا حیران رہ جاتا۔ اس کے پوتے اور پڑپوتے تک اطمینان سے بیٹھ کر کھاتے۔ سلطان محمد تغلق کی بخششوں کی بدولت بہتیرے فقیر امیر بن گئے۔ بہتیرے غریب اور مسکین مالدار و دولت مند ہو گئے۔ سچ یہ ہے کہ جو کچھ حاتم نے برامکہ نے۔ اور معن زائدہ نے برسوں میں دیا تھا اُتنا اُس بادشاہ نے ذرا سی دیر میں دیدیا۔ جب اس نے بہادر شاہ کو سنار گاؤں کا حاکم بنایا تو خزانہ کا خزانہ اس کو بخش دیا۔ اس کے

---

[1] سلطان محمد تغلق عالم کی عجائبات میں سے تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کی تیزی غضب کی تھی جس تک میں پہونچ بھی نہیں سکتا۔ اُس کی دانائی کو بھی میں بیان نہیں کرسکتا۔

علاوہ ملک سنجر کو آٹھ لاکھ ٹنکے دیئے اور ملک الملوک عمادالدین کو ستر لاکھ۔ سید عضد الدولہ کو چالیس لاکھ ٹنکے دیئے۔ مولانا ناصر طوئی کو اور قاضی کاسنہ اور خداوندزادہ غیاث الدین کو اور خداوندزادہ قوام الدین کو اور ملک اللہ ماناصر کافی کو لاکھوں اشرفیاں دے ڈالیں بہتیروں کو سالانہ بخششیں دیا کرتا۔ ملک بہرام غزنوی کو ہر سال سولا کھ ٹنکے دیتا۔ اور غزنی کے قاضی کو اس قدر دیا کہ اُس غریب نے اپنی آنکھ سے کبھی اتنا دیکھا بھی نہ ہوگا، اور یہ سب بخششیں ایک دفعہ ہی ہو کر نہیں رہ گئیں، بلکہ برابر ہوتی ہی رہیں۔ وہ کونسا صاحب کمال تھا جسے سلطان محمد تغلق کے دربار سے وظیفہ نہ ملتا ہو؟ سلطان کی قدردانی اور دریادلی کا سن سنکر دُور دُور سے۔ خراسان سے۔ عراق سے۔ بخارا اور سمرقند سے۔ خوارزم سے سیستان سے۔ ہرات سے۔ مصر سے اور دمشق سے لوگ اس کے دربار میں آتے تھے اور بڑے بڑے انعام پاتے تھے۔

سلطان محمد تغلق کے دَور میں ہر درجے کے سینکڑوں مغل امیران تمن ہوں یا امیران ہزارہ بڑے بڑے سردار ہوں یا شہزادے برابر ہندوستان میں آتے رہے۔ اسی طرح عورتیں بھی قریب قریب ہر سال آتی رہیں۔ دربار میں ان سب کی بڑی عزت ہوتی بہتیروں کو خلعت دیئے جاتے تھے جنھیں لے کر بعض تو واپس چلے جاتے اور بعض سرکاری ملازمت کر لیتے اور وہیں رہنے لگتے۔ اُن پر اور بھی بخشش ہوتی۔ جواہرات دیئے جاتے۔ زربفت اور زردوزی کے کپڑے۔ سنہرے پٹکے اور چست چالاک گھوڑے دیئے جاتے۔ اور جاگیریں بھی عطا ہوتیں۔

میں لکھ چکا ہوں کہ سلطان محمد تغلق خدا کی خدائی میں ایک عجوبہ آدمی تھا اور میں پھر بھی لکھنے کو تیار ہوں کہ اُس میں سخاوت۔ جوانمردی اور بلند پروازی تو تھی ہی، مگر اس کے علاوہ اور بھی بڑے پائے کی خوبیاں تھیں۔ سلطنت کے ایسے نئے طریقے اپنی طبیعت سے نکالتا کہ انھیں دیکھکر آصف۔ ارسطاطالیس اور احمد حسن اور نظام الملک طوسی بھی حیران رہ جاتے۔

سلطان محمد تغلق کی طبیعت میں ایجاد کا بڑا مادہ تھا۔ صلاح اور مشورے کی اُسے پرواہ نہ تھی۔ اگرچہ دربار میں صلاح کار اور مشیر موجود رہتے اور سلطان اُن سے مشورہ کرتا بھی۔ لیکن سلطنت کے معاملات میں چھوٹے ہوں یا بڑے وہ کسی کو دخل نہ دیتے دیتا اپنی ہی سمجھ سے سلطنت کے کام کرتا۔ اپنے دل میں جو بات آجاتی اُسی کو الہام سمجھتا۔ اس کے مقابلے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اپنی رائے ظاہر کر سکے۔ رائے دینے والے سب ایک زبان ہو کر اس کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے اور ہر بات پر اس کی تعریف کیا کرتے۔

سلطان محمد تغلق بڑا مردم شناس تھا جس آدمی کو ایک نظر دیکھ لیتا اُس کی خوبیاں اور بُرائیاں فوراً تاڑ لیتا۔ جو لوگ اُس کے دربار میں آکر بیٹھتے اُن کی قابلیتوں اور ان کی اچھی بُری باتوں کا دم بھر میں اندازہ کر لیتا، اور کچھ دربار میں آنے والوں ہی پر منحصر نہ تھا جو لوگ اُس کے دربار میں نہ آتے تھے یا پہلے گزر چکے تھے اُن کا بھی صحیح اندازہ کر لیتا۔

خوش بیانی میں بے نظیر تھا۔ اگر صبح سے لیکر شام تک برابر باتیں کرتا رہتا تو بھی سننے والوں کو ذرا بار نہ گزرتا۔ بلکہ جتنا زیادہ بولتا اُتنا ہی اُن کا اشتیاق بڑھتا جاتا۔ انشا میں بھی یہی حال تھا۔ دنیا بھر کے انشا پرداز بادشاہ کی عبارتیں پڑھتے تو حیران رہ جاتے، سلطان محمد تغلق کی خوش نویسی۔ جملوں کی سادگی اور عبارت آرائی یہ ایسی خوبیاں تھیں جو بڑے بڑے استادوں کو شرما دیتیں۔ اُس کی مثل لکھنا کسی بڑے سے بڑے استاد سے بھی بن نہ پڑتا تھا۔ اُس کو فارسی کے شعر بھی یاد تھے۔ اُن کے معانی و مطالب بھی وہ خوب سمجھتا تھا۔ اکثر برمحل شعر لکھتا اور خود بھی کہتا۔ سکندر نامہ اُس کو یاد تھا بو مسلم نامہ اور تاریخ محمودی ہر وقت اپنے سامنے رکھتا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ اس کا حافظہ بلا کا تھا۔ ایک مرتبہ کان میں بات پڑ جاتی تو کبھی نہ بھولتا۔ طب میں بھی ماہر تھا۔ بہت سے مرضوں کا لاجواب علاج کرتا تھا۔ بیماروں کی نبض دیکھتا اور دوائیں دیتا۔ دوسرے طبیبوں سے تشخیص مرض کے متعلق بحث کرتا اور دواؤں کی نسبت تحقیق کرتا۔ اگر طبیب ہار جاتے تو اُنھیں ملزم ٹھہراتا۔ معقولات سے دلی لگاؤ تھا۔ فلسفہ۔ منطق اور سائنس بھی خوب پڑھتا تھا۔ فلسفے اور منطق کا سکہ اُس کے دل پر ایسا جم گیا تھا کہ معقول کے سوا کسی بات کا یقین نہ کرتا۔ کوئی عالم۔ فاضل۔ شاعر یا طبیب سلطان محمد تغلق کے سامنے تقریر نہ کر سکتا۔ اور اگر کرتا بھی تو ہر وقت اُسے سلطان کے مشکل سوالوں کا کھٹکا لگا رہتا۔ آخر میں وہ خود ہی خاموش ہو جاتا۔

شجاعت اور بہادری کچھ تو سلطان محمد تغلق کو وراثت میں ملی تھی اور کچھ اُس نے خود حاصل کی تھی۔ اس اعتبار سے بھی وہ یکتائے زمانہ تھا۔ بلا کا سوار تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس جیسا سوار شاید ہی کسی زمانے میں پیدا ہوا ہو۔ تیر پھینکنے میں۔ نیزہ مارنے میں۔ گیند پھینکنے میں۔ شکار کھیلنے میں۔ گھوڑا کُوداںے میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ بڑی بڑی فوجیں پراگندا جا پڑتا۔ صفوں کی صفوں کو چیرتا چلا جاتا۔ اصل یہ ہے کہ شجاعت اُس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس کا باپ تغلق اور اس کا چچا رجب کیسے بہادر تھے۔ ان کی بہادری کی شہرت ہندوستان کے باہر دُور دُور پہونچ چکی تھی۔ اُنھیں کی طرح یہ بھی بہادر تھا۔ اس کی بہادری ہندوستان ہی میں نہیں خراسان میں بھی ضرب المثل ہو گئی تھی۔

غرض اس کو ہر وصف میں کمال تھا بخشش پر آتا تو جتنا کہ حاتم طائی سو کو دیتا اُتنا یہ ایک ہی سائل کو دے ڈالتا۔ ملک فتح کرنے پر اُترتا تو خراسان اور عراق، سمرقند اور بخارا اور خوارزم کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ افسوس! ہزار افسوس! باوجود ان تمام خوبیوں اور فضیلتوں کے سلطان محمد تغلق کو اُٹھتی ہوئی جوانی میں صحبت ملی تو سعد منطقی جیسے بدمذہب کی اور عبید شاعر جیسے بد اعتقادی کی، اور نجم انتشار جیسے فلسفی کی، اور مولانا علم الدین جیسے فلاسفر کی۔ انھیں لوگوں کے ساتھ وہ اُٹھتا بیٹھتا۔ انھیں کے ساتھ گھنٹوں خلوت میں رہتا۔ یہ لوگ ہر وقت فلسفے اور منطق میں ڈوبے رہتے تھے۔ اُٹھتے اور بیٹھتے منطق چھانٹتے۔ فلسفے۔ منطق اور سائنس کا اثر دل پر بُرا پڑتا ہے۔ مذہب سنت والجماعت کی طرف سے بداعتقادی پیدا ہو جاتی ہے، اور ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے جو کچھ تعلیم دی ہے اس کی مخالفت دل میں قایم ہو جاتی۔ یہی حال سلطان محمد تغلق کا ہوا۔ اس کی نظروں میں آسمانی کتابوں کی، زبور کی۔ توریت کی اور انجیل کی یہاں تک کہ قرآن مجید کی۔ نبیوں کی اور ان کی تعلیمات کی وقعت نہ رہی۔ یہ باتیں جو اصل اسلام ہیں اور ذریعہ نجات ہیں سلطان محمد تغلق کے نزدیک بالکل حقیر ہو گئیں۔ علم معقول

سے ایسا انس تھا کہ اس کے خلاف کوئی بات سننا بھی پسند نہ کرتا اور اگر سن لیتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔ اسی وجہ سے وہ خونریزی پر اُتر آیا تھا۔ اگر اس کے دل میں فلسفے اور منطق کی باتیں نہ جم گئی ہوتیں اور اس کا رجحان آسمانی کتابوں کی طرف ہوتا یا آسمانی کتابوں پر اُسے عبور ہوتا اور اُن کا پورا علم اُسے ہوتا تو پھر حکم خدا۔ حکم رسول۔ حکم انبیا اور حکم علماء کے خلاف مومنوں اور مسلمانوں کو قتل کرنے کی ہرگز جرأت نہ کرتا۔ بات یہ ہے کہ فلسفے اور منطق کے مطالعے سے دل سخت ہو جاتا ہے۔ سلطان محمد تغلق کا دل بھی سخت ہو گیا تھا۔ دل کو نرم کرنے والی چیزوں کی، آسمانی کتابوں کی اور حدیثوں کی سلطان کے دل میں ذرا بھی جگہ نہ تھی۔ نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ سلطان محمد تغلق مومنوں اور مسلمانوں کا خون بہانے پر اُتر آیا۔ نہ معلوم کتنے عالموں۔ سیدوں۔ صوفیوں۔ قلندروں۔ لشکریوں اور ملکی عہدہ داروں کے گلے کٹوا دیئے۔ کوئی ہفتہ ایسا نہ گزرتا اور کوئی دن ایسا نہ جاتا جس میں مسلمانوں کے خون کی ندی اس کے سامنے بہہ نہ جاتی ہو۔

سلطان محمد تغلق کو مسلمانوں کا خون بہانے کی عادت ہو گئی تھی۔ اس کا دل پہلے ہی سخت تھا۔ اُس میں غور و فکر کا مادہ بہت کم تھا۔ اُس کے مزاج میں جلدی غضب کی تھی، جو بات اُس کے ذہن میں آجاتی اُس کا فوراً حکم دیتا اور جن باتوں کا حکم دیتا وہ ایسی ہوتیں کہ اُن پر عمل کرنا اہل کاروں اور کارکنوں کے امکان سے باہر ہوتا۔ عمل نہ ہو سکتا اور مرضی کے مطابق بات نہ ہوتی تو سلطان محمد تغلق اہل کاروں، کارکنوں اور عالموں سے ناراض ہو جاتا، اور اُن پر بدنیتی اور بداندیشی کے شبہے کرتا۔ انھیں باغی سمجھتا اور قتل کرنے پر تُل جاتا۔ قتل کرتا تو ایک دو کو نہیں ہزاروں کو قتل کر دیتا، اور اہلکاروں پر بس نہیں کرتا رعایا پر بھی نافرمانی کا جرم لگاتا۔ اُن کی بھی شامت آجاتی۔

میں سلطان محمد تغلق سے ڈرتا ہی رہتا۔ اس کے خوف سے الٹی سیدھی باتیں بھی کہہ دیتا۔ دن کو رات اور رات کو دن بتا دیتا۔ اسی وجہ سے مجھے اس کا تقرب حاصل تھا ہزاروں کے بارے میں بھی میں اُسے نہ ٹوکتا۔ اتنا بھی نہ کہتا کہ بادشاہ سلامت! ایسی سخت سخت سزائیں جو آپ دیتے ہیں ناجائز ہیں اور شریعت کے خلاف ہیں۔ بات یہ تھی کہ اِدھر تو مجھے اپنی جان کا خوف تھا۔ اُدھر لالچ دامنگیر تھا۔ اس سبب سے سلطان کے سامنے حق بات میں کبھی نہ کہتا۔ اُس کی ہاں میں ہاں ملا دیا کرتا۔ اور اُس کی سی کہنے لگتا۔ گھڑی ہوئی حدیثیں پڑھ دیتا۔ خدا رسول کا گنہگار ہوتا، اور شریعت کے اور مذہب کے خلاف عمل کرتا، اور لوگ بھی ایسا ہی کرتے، نہ معلوم ان کا کیا حشر ہوگا۔ مجھے تو اپنے کیے کی سزا اس قدر جلد مل گئی کہ میں اس بڑھاپے میں ذلیل و خوار ہو گیا۔ افلاس کی مار مجھ پر پڑ گئی ایک ایک دروازے پر بھیک مانگنے کی نوبت آگئی ہے، مرنے کے بعد نہ معلوم میری کیا حالت ہوگی۔ اور کیسی کیسی سزائیں مجھے بھگتنی پڑیں گی؟ جو کچھ میں نے سلطان محمد تغلق کے دربار میں کہا یا کیا میں آج اُس کی پاداش میں مبتلا ہوں، اس بڑھاپے میں ذلیل بھی ہوں اور مفلس بھی۔

مطلب میرا یہ ہے کہ میں نے پرورش پائی تو سلطان محمد تغلق کے سائے میں اور مجھے ترقی ہوئی تو اسی کے طفیل سے اور میں نے کچھ حاصل کیا تو اُس کی نوازش سے۔ اب اس کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا تو شاید وہ نعمتیں اب مجھے خواب میں بھی دیکھنی نصیب نہ ہوں گی۔ اگر سلطان محمد تغلق میں وہ بُری باتیں نہ ہوتیں جن کی وجہ سے اُس نے مسلمانوں کے گلے کاٹے اور اپنی سلطنت کی بنیادوں کو ہلا دیا اور اپنے خلاف ساری دنیا میں نفرت پھیلا دی، تو پھر وہ یقیناً بے نظیر اور بے مثل ہوتا۔ اُس وقت یہ کہنا کہ سلطان محمد تغلق جیسا قابل بادشاہ آدم سے لے کر اِس وقت تک کوئی نہیں ہوا۔ بجا ہوتا۔ اول تو یہ بادشاہ فلسفے اور منطق کا بڑا معتقد تھا دوسرے قرآن اور حدیث کے علم میں مضبوط نہ تھا۔ تیسرے مسلمانوں کو سزائیں دینے اور قتل کرنے کا عادی تھا۔ چوتھے وہ اپنی بات کو رکھنے اور رعیت پر جبر کرنے کا خوگر تھا۔ پانچویں نئے نئے فرمان نکالنے پر آمادہ تھا۔ چھٹے بے رحمی اور خونریزی پر جری تھا۔

میں کیونکر لکھوں کہ سلطان محمد تغلق سارے جہان میں عجوبہ تھا۔ رات دن شریروں اور بدمعاشوں کے دفع کرنے کی فکریں کرتا رہتا، ہزاروں کو قتل کرا دیتا۔ پھر بھی دنیا بھر کے چھٹے ہوئے بدمعاشوں کو اُس نے اپنا مقرب بنا لیا تھا۔ اس کو میں اعجوبۂ مخلوقات نہ کہوں تو پھر کیا کہوں؟

میں تاریخ فیروز شاہی کا مؤلف ہوں۔ لیکن حیران ہوں! سلطان محمد تغلق کے وصفوں کو کیا لکھوں؟ ایک طرف تو اُس میں خدا کے سے وصف تھے۔ دوسری طرف بندوں کی سی صفتیں تھیں۔ مجھے تو اس کے نہ کسی وصف کا یقین ہوا اور نہ اس کی کسی صفت کا۔ مجھ کو اُس کی بندگی۔ اطاعت، عبادت ریاضت کا کیونکر یقین آئے۔ اور اس کی جودت یا جدت دانائی یا تیزی یا ہوشیاری کیسے مجھ پر ثابت ہو۔ جب کہ میں اپنی آنکھوں سے برابر دیکھتا رہا کہ ستائیس سال تک وہ محمد نام والے بادشاہوں کو ذلت و حقارت کی نظر سے دیکھا کیا اور ساتھ ہی اپنی ایمانداری اور درست اعتقادی کا دعویدار بنا رہا، اور اپنے آپ کو سلطان کہتا اور کہلواتا رہا۔ غور کا مقام ہے کہ جس شخص کا اپنا نام محمد ہو وہ اسی نام کے سبب پہلے بادشاہوں سے نفرت کرے اور اُن کا نام لینا بھی اپنے لئے ننگ و عار سمجھے۔ اس پر طرہ یہ کہ عباسی خلفاء کا خواہ مردہ ہی کیوں نہ ہوں غلاموں سے بھی زیادہ احترام کرے۔

جو کچھ سلطان محمد تغلق کا انتہائے ایمان و اعتقاد تھا، اس کا اندازہ میں نے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر ٹھیک طور سے کر لیا۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ ہر روز سنی مسلمانوں کو سلطان کے حکم سے سزائیں دی جاتی تھیں اور اُن کی گردنیں کھیرے لکڑی کی طرح کاٹ دی جاتیں تھیں۔ ہر روز محل سرا کے سامنے اُن کے خون کی ایک ندی بہہ جاتی تھی۔ اس کام کے لئے سلطان نے ایک علیحدہ محکمہ بنا لیا تھا جس کا نام ایوان سیاست رکھا تھا بے دینوں اور موذیوں کو چن چن کر اس کا ناظم اور مدیر بنایا تھا۔ کافروں اور مرتدوں کو اس کا حاکم۔ ناظم گماشتہ اور کارکن بنا رکھا تھا۔ اس ایوانِ سیاست نے جو ظلم ڈھائے اُن سے زمین و آسمان کے رہنے والے سب انسان اور سب فرشتے بیزار ہو گئے۔ بادشاہ کے خلاف عام نفرت پھیل گئی۔

میں ایک بے دین اور بد دیانت شخص تھا، جو سلطان محمد تغلق کا گُن دلال بنا ہوا تھا۔ اس صورت سے برسوں تک میں بادشاہ کا مقرب بنا رہا۔ اب کیا کہوں کہ اس کی کونسی ادا کو میں اچھی طرح سے سمجھا، اور میرے نزدیک وہ تھا کیا۔ مجھے تو اس کی متضاد صفتوں پر جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں حیرت ہی حیرت ہے اور وقتی ضرورت سے مجبور ہو کر میں اس کے سوا کچھ نہیں لکھ سکتا کہ سلطان محمد تغلق خدا کی بنائی ہوئی ایک عجوبہ چیز تھا، مصلحت بھی اسی میں ہے، اس کے وصف جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں سمجھ میں آہی نہیں سکتے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ

کوئی اپنے علم اور اپنی عقل کے ذریعے سے اُن پر حاوی ہوسکے۔

میں تاریخ فیروز شاہی کا مؤلف ہوں اور سترہ سال اور تین مہینے تک سلطان محمد تغلق کے دربار میں ملازم رہ چکا ہوں۔ اس نے مجھے بہتیرے انعام دیے۔ بار بار مجھ پر بخششیں بھی کیں اور مجھے اشرفیاں بھی دیں۔ لیکن مجھے تو یہ بادشاہ عجوبہ سا ہی نظر آتا رہا۔ اُس کے وصف ایک دوسرے کے بالکل برعکس تھے اور اس کی صفتیں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ جنھیں دیکھ دیکھ کر میں دریائے حیرت میں غرق ہو جایا کرتا تھا۔ میں نے تمام عمر اُس کی زبان سے بداصلوں اور کمینوں کی برائی سنی تھی اور دراصل کمینوں اور رذیلوں کو وہ اچھا نہ جانتا تھا۔ اکثر کہا کرتا تھا کہ یہ لوگ کم اصل، نمک حرام، شریر اور بدخو ہوتے ہیں۔ اور ثبوت میں دلیلیں بھی پیش کیا کرتا، معلوم ہوتا تھا کہ بداصلوں سے اُس کو دلی نفرت ہے۔ پھر بھی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے گویئے کے بیٹے نجبا بداصل کو سر پر چڑھا لیا اور اُس کا درجہ امیروں سے بھی بڑھا دیا۔ گجرات اور ملتان اور بدایوں کے علاقے اُس کے حوالے کر دیے۔ اسی طرح سے سلطان محمد تغلق نے عزیز چمار کو، اس کے بھائی کو اور فیروز حجام کو، منکا باورچی کو، لدھا مالی کو اور مسعود کو جو شراب بنانے والوں اور شراب بیچنے والوں کے گھرانے سے تھا۔ اور ایسے ہی بہت سے نیچ ذات والوں کو اونچے اونچے عہدے دے دیے۔ انھیں جاگیریں بھی دیں اور ان کی بڑی توقیر کی۔ جولاہے کے بیٹے شیخ بابو نایک کو اپنے دربار کا مقرب بنا لیا۔ اور پیرا مالی کو جو سارے ملک کے کمینوں اور رذیلوں میں پرلے درجے کا کمینہ اور رذیل تھا دیوانِ وزارت کا سردار بنا دیا، اور اسی پر بس نہ کی بلکہ اُس کو تمام عالموں، امیروں، والیوں، جاگیرداروں اور حاکموں کا نگران بھی بنا دیا، اور بازوں کے اُڑانے والے کشن اندری کو جو نہایت کمینہ رذیل تھا اودھ کا علاقہ دے دیا۔ اور احمد ایاز کے غلام مقبل کو جو ہر اعتبار سے رذیل بلکہ ارذل تھا گجرات کا نائب وزیر بنا دیا۔ یہ عہدہ معمولی نہ تھا۔ اتنا بڑا تھا کہ نامور وزیروں اور بڑے بڑے خانوں ہی کو دیا جاتا تھا۔ تعجب ہے ایسے بڑے بڑے اور ذمہ داری کے عہدے سلطان محمد تغلق کمینوں اور رذیلوں کو کیسے دے دیتا تھا۔

حوصلہ ایسا تھا کہ جمشید اور خسرو کی برابری کا اسے دعویٰ تھا۔ خود دار ایسا تھا کہ مغلستان اور بنگالے کے حاکموں کو ملازم رکھنے میں بھی اپنی سبکی سمجھتا تھا، اور بڑے بڑے عالی دماغوں اور عالی نسبوں کو اپنی ملازمت کے قابل نہ جانتا تھا۔ مگر بداصلوں اور کمینوں کو جاگیریں دے دیتا، اور بڑے بڑے عہدوں پر انھیں ممتاز کرتا۔

مختصر یہ کہ سلطان محمد تغلق کی یہ متضاد صفتیں دیکھ دیکھ کر میں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ اگر اُس کی سفلہ پروری اور کمینہ نوازی کو اس کی خدائیت اور بے نیازی کی دلیل سمجھوں اور مخلوق کو ان کا زیردست اور محتاج بنا دینے میں سلطان محمد تغلق کی بے نیازی تصور کروں۔ یوں سوچوں کہ جس طرح خدا اپنی بے نیازی سے رذیلوں اور کمینوں اور کافروں اور مشرکوں کو سلطنتیں دیدیا کرتا ہے اسی طرح یہ بادشاہ بھی ہر ایک کو یہاں تک کہ دشمنوں کو بھی حکومت دے دیتا ہے اور جس طرح کمینوں کو حکومت دیتے وقت خدا کو اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہوتی کہ یہ کمینے شریفوں پر حکمرانی کریں گے۔ اسی طرح اس بادشاہ نے بے دھڑک رذیلوں اور کمینوں کو ترقی کے زینوں پر چڑھا دیا ہے اور خلقت کو اُن کا دستِ نگر بنا دیا ہے تو یہ بھی ممکن نہیں۔ اس لئے کہ سلطان محمد تغلق کی عبادت اور بندگی حد درجہ کی ہے۔

اس کی عبادت کا یہ حال ہے کہ اِدھر اذان سنتا ہے اُدھر نماز کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور صبح کی نماز کے بعد بڑی بڑی دیر تک وظیفہ پڑھتا رہتا ہے۔ جب حرم سرا میں جانے لگتا ہے تو خواجہ سراؤں کو اندر بھیج کر پہلے اطلاع کرا دیتا ہے۔ تاکہ نامحرم عورتیں ہٹ جائیں اور اُن پر نظر نہ پڑ جائے۔ لڑکپن میں اُس نے قتلغ خاں سے کچھ پڑھا تھا۔ اسی وجہ سے اب تک وہ اُس کی بڑی تعظیم کرتا ہے۔ میرے نزدیک جتنی تعظیم و تکریم وہ کرتا ہے اتنی کوئی شاگرد اپنے استاد کی نہیں کرتا۔

وہ اپنی والدہ مخدومہ جہاں کی بھی بڑی تعظیم کرتا ہے اور بے حد فرمانبرداری کرتا ہے اس کی مرضی کے بغیر اور اس کے حکم کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کرتا۔ میں حیران ہوں کہ ان صفتوں کو سلطان محمد تغلق کی بندگی اور نیازمندی پر محمول کروں یا اس کی خدائیت کی دلیل سمجھوں! میں تو تہ تک پہونچ نہیں سکتا اور حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا۔ اس لئے کہتا ہوں اور لکھے دیتا ہوں کہ خدا نے سلطان محمد تغلق کو ایک نرالی، عجوبہ اور حیرت انگیز شے بنا دیا تھا۔"

ابنِ بطوطہ نے لکھا ہے کہ "سلطان محمد بخششوں کے دینے میں اور خون کے بہانے میں مشہور تھا۔ کوئی روز ایسا نہ جاتا تھا جس میں اس کے دروازے پر کوئی فقیر امیر نہ بنا دیا جائے اور کوئی زندہ آدمی قتل نہ کر دیا جائے۔ سارے ملک میں اس کی سخاوت اور شجاعت کا ذکر ہوا کرتا تھا اور اس کی سختی کے چرچے رہتے تھے۔ مگر وہ بہت ہی متواضع، خلیق اور مہمان نواز

ادیب کے خریدار

جب ادیب کے متعلق ہمیں کوئی خط بھیجیں تو اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں اور صاف تحریر فرمائیں، اور پتہ کے ساتھ نمبر خریداری ضرور دیں۔

نیز ادیب کبھی نہ پہنچے تو اس کی اطلاع زیادہ سے زیادہ ۵ تاریخ تک لکھ دینی چاہیئے

منیجر ادیب دہلی

تھا۔ عدل و انصاف کا فدائی تھا۔ شریعت کا شیدائی تھا۔ بے دھڑک حق کی طرفداری کرتا۔ شریعت کے قوانین برقرار رکھنے میں کوشاں رہتا، نماز پابندی سے پڑھتا اور دوسروں کو پابندی سے پڑھنے کی تاکید کیا کرتا۔ جو لوگ جان بوجھ کر نماز ترک کرتے انھیں سزائیں دیتا۔ اس کی نیکیاں حد سے بڑھ گئیں تھیں۔

اس کی سخاوت کی شہرت ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ یمن۔ خراسان اور فارس میں بھی پھیل گئی ہے۔ وہاں کے رہنے والے اس کی داد و دہش سے خوب واقف ہیں۔ جانتے ہیں کہ سلطان محمد تغلق پردیسیوں کو ہندوستانیوں پر ترجیح دیتا ہے۔ انھیں جاگیریں بخشتا ہے۔ انعام دیتا ہے اور بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز کرتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ پردیسی کو پردیسی کہہ کر نہ پکارا جائے۔ پردیسی کہنے سے پردیسی آدمی کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ بجائے پردیسی کے عزیز کہکر پکاریں۔ جتنے پردیسی دربار میں آتے رہے سلطان محمد تغلق اُن سب پر برابر بخششیں کرتا رہا۔

شہاب الدین گازرونی ملک التجار کھمبایت اور گجرات کے حاکم پرویز نامی کے یہاں آیا اور اسی کے ہمراہ بادشاہ کی زیارت کو چلا۔ راستے میں دشمنوں نے پرویز کو قتل کر دیا اور شہاب الدین کا مال جسے وہ بادشاہ کی نذر کے لئے لے جا رہا تھا لوٹ لیا۔ بادشاہ کو خبر ملی تو حکم دیا کہ تیس ہزار روپے شہاب الدین کو فوراً دے دیے جائیں۔ شہاب الدین دربار میں حاضر ہوا تو سلطان نے اُسے اور دیا۔ چند روز بعد شہاب الدین بیمار پڑ گیا۔ دربار تک آ بھی نہ سکتا تھا۔ بادشاہ نے ایک لاکھ ٹنکے اس کے مکان پر بھجوا دیے۔ جب ابوالعباس خلیفہ عباسی کا ایلچی شیخ رکن الدین نامی مصر سے دہلی آیا اور دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اسے بے شمار دیا۔ گھوڑے کا ساز تک دیا اور ایسا دیا جو کل کا کل سونے کا تھا۔ میخیں بھی سونے کی تھیں۔ اسی طرح ناصر الدین ترمذی واعظ ہندوستان آیا تو سلطان نے اس پر بخششیں کیں اور جب وہ اپنے وطن کو واپس جانے لگا تو اسے ایک لاکھ ٹنکے اور دیدیے۔ عبدالعزیز فقیہ نے دمشق میں سلطان محمد تغلق کی شہرت سنی تو وہاں سے چل پڑا اور دہلی کا رُخ کیا۔ سلطان نے اس پر بھی بخششیں کیں۔ ایک روز اس نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے فضائل بیان کئے اور خلفائے عباسیہ کا ذکر کیا تو بادشاہ بہت خوش ہوا۔ حکم دیا کہ سونے کی ایک تھالی میں دو ہزار اشرفیاں لائی جائیں۔ اشرفیوں سے بھری ہوئی سونے کی تھالی آئی جو بادشاہ نے اپنے ہاتھ سے عبدالعزیز کو دے دی۔ شمس الدین اندگانی نامی شاعر نے سلطان محمد تغلق کی تعریف میں ایک فارسی قصیدہ لکھکر پیش کیا تو بادشاہ نے اس کو ہر شعر کے عوض ہزار دینار دیے۔ اس حساب سے بہت بڑی رقم شمس اندگانی کے ہاتھ آئی۔

قاضی مجید الدین، برہان الدین اور عضد الدین کی قابلیتوں اور خوبیوں کی شہرت سنی تو بادشاہ نے اُن سب کو گھر بیٹھے بیٹھے بڑی بڑی رقمیں بھیج دیں۔ برہان الدین کو چالیس ہزار ٹنکے بھیجے اور عضد الدین کو دس ہزار۔ ان دونوں میں سے کوئی ہندوستان تک آیا بھی نہ تھا۔

سلطان محمد تغلق نے سب سے زیادہ داد و دہش مخدوم زادہ امیر غیاث الدین محمد عباسی بغدادی پر کی۔ جو خلیفہ المستنصر باللہ کی اولاد سے تھا، اور ابن الخلیفہ کے لقب سے مشہور تھا۔ اس کے لئے بادشاہ نے سیری کا محل سونے چاندی کے برتنوں سے، سنہری حمام سے اور قیمتی قیمتی چیزوں سے خوب سجایا اور پھر سارا محل مع کل آرائش کے اسی کو بخشیا۔ جب مخدوم زادہ محل میں داخل ہوا تو بادشاہ نے چار لاکھ ٹنکے اسے سر شوئی کے نام سے بھیجے۔ اور پھر تین سو ٹنکے روزانہ خرچ کے لئے مقرر کر دیے۔ یہ خرچ کھانے سے علاوہ تھا کھانا دونوں وقت شاہی دسترخوان سے جاتا تھا۔ سلطان نے سیری کا شہر بھی اس کے حوالے کر دیا۔ شہر کے ساتھ بہت سے باغ بھی دیے اور حویلیاں بھی۔ اس کے علاوہ سو گاؤں اور عطا کئے اور دہلی کی نواح میں سارے مشرقی علاقے کی حکومت اسی کو سونپ دی۔ پھر سواری کی غرض سے تیس خچر بھیجے۔ جن کے زین سونے کے تھے۔ اُن کا چارہ وغیرہ سرکاری گودام سے مقرر کیا۔

شام کا حاکم امیر سیف الدین دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے اس پر بھی بہت بخششیں کیں۔ اس کی خاطر داری کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ عرب تھا، اور سلطان کو عربوں سے بہت انس تھا۔ ایک مرتبہ مانکپور کے حاکم ملک اعظم بایزیدی نے دربار میں نذر پیش کی جس میں گیارہ اصیل اور تازی گھوڑے تھے۔ سلطان نے وہ سب کے سب امیر سیف الدین کو دے دیے۔ پھر دس گھوڑے اور دیے۔ جن کے زین بھی سونے کے تھے، اور رکابیں بھی سونے کی۔ بعد میں اُس کی شادی بادشاہ نے اپنی بہن فیروزہ اخوندہ سے کر دی۔

سلطان محمد تغلق جس طرح تواضع میں مشہور تھا اسی طرح انصاف پرستی میں بھی شہرہ آفاق تھا۔ ہندو امیروں میں سے ایک امیر نے قاضی کے دربار میں نالش دائر کی کہ "بادشاہ نے میرے بھائی کو بے جرم قتل کر دیا ہے۔" بادشاہ کو خبر ہوئی تو مدعا علیہ کی طرح قاضی کے دربار میں آیا اور اس ہئیت سے آیا کہ نہ تو بدن پر زرہ تھی نہ بکتر۔ نہ کوئی حربہ تھا نہ ہتھیار۔ قاضی کو پہلے سے کہلا بھیجا تھا کہ جب میں عدالت میں پہنچوں تو تم نہ میری تعظیم کے لئے اُٹھنا نہ ادب کرنا۔ غرض بادشاہ عدالت میں داخل ہوا تو پہلے اُس نے قاضی کو سلام کیا۔ پھر ملزموں کے مقام پر جا کھڑا ہوا۔ قاضی نے مقدمے کی روئداد سنکر حکم دیا کہ "بادشاہ اُس ہندو کو راضی کر لے ورنہ قصاص کا حکم دیا جائے گا۔"

ایک دفعہ کسی مسلمان نے سلطان محمد تغلق پر اس بات کی نالش کی کہ "میرا کچھ مال جا ہئے جسے سلطان فوراً ادا کر دے۔" قاضی نے حکم دیا کہ "بادشاہ مال واپس کر دے۔" اسی طرح کسی امیر کے لڑکے نے بادشاہ پر اس بات کا دعویٰ کیا کہ "بادشاہ نے بغیر جرم کے مجھے مارا ہے" مقدمہ عدالت میں دائر ہوا قاضی نے حکم دیا کہ "بادشاہ اس لڑکے کو مال دے کر راضی کرے ورنہ قصاص کے لئے تیار ہو جائے۔" یہ سنکر بادشاہ قاضی کی عدالت سے اپنے دربار میں آیا اور وہاں لڑکے کو بلا کر اس کے ہاتھ میں لکڑی دی اور کہا "تجھے میرے سر کی قسم تو بھی مجھکو اسی طرح مار جس طرح میں نے تجھے مارا تھا۔" لڑکے نے بادشاہ کو اکیس لکڑیاں ماریں۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی ٹوپی بھی گر پڑی۔

(باقی آئندہ)

ادیب کے لئے

ہر شہر اور قصبہ میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے

منیجر ادیب، دہلی سے خط و کتابت کیجیے

خمسہ

(افکارِ تازہ:- خان صاحب جناب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبرآبادی)

آہوں سے اضطراب میں چھالے زباں کے ہیں برہم مزاج نالۂ آتش فشاں کے ہیں
کیا کہئے کیا ارادے دلِ ناتواں کے ہیں اب دیکھنا ہے کتنے ستم آسماں کے ہیں
محشر بدوش آج سلیقے فغاں کے ہیں

دن رات ہیں جو تیرِ غم و رنج کا شکار اک اک تڑپ ہے جن کی قیامت سے ہمکنار
جن پر ہے اضطرابِ دو عالم کو اختیار ذرّے جو کوئے دوست میں رہتے ہیں بیقرار
ٹکڑے وہی تو میرے دلِ ناتواں کے ہیں

دودِ فغاں ہر اشکِ محبت ہے آج کل دوزخ نشاں ہر اشکِ محبت ہے آجکل
برقِ تپاں ہر اشکِ محبت ہے آج کل آتش بجاں ہر اشکِ محبت ہے آجکل
اے ہم نشیں کرشمے یہ سوزِ نہاں کے ہیں

ہیں بے خودی کے جور ہمیں کچھ خبر نہیں اللہ رے یہ طور ہمیں کچھ خبر نہیں
یہ ہے مقامِ غور۔ ہمیں کچھ خبر نہیں ہم ہیں سفر میں اور ہمیں کچھ خبر نہیں
منزل ہے کیا ہماری مسافر کہاں کے ہیں

کہنا پڑا یہ ہم کو بالفاظ مختصر پرساں نہیں ہے کوئی بھی اِن کا دمِ سحر
ممکن نہیں کہ پہنچیں اجابت کے باب پر کیوں کر دعائے شوق کا اُلٹا نہ ہو اثر

نکلے ہوئے یہ لفظ ہماری زباں کے ہیں

شکوہ زباں پہ لائے تو آئی صدائے غیب ماتھے پہ بل جو آئے تو آئی صدائے غیب
پیچھے قدم ہٹائے تو آئی صدائے غیب جب پاؤں ڈگمگائے تو آئی صدائے غیب
اُلفت کی راہ میں یہ مقام امتحاں کے ہیں

اب آسماں سے کہدو کہ ان کو بھی پھونک دے نامہرباں سے کہدو کہ ان کو بھی پھونک دے
آتش فشاں سے کہدو کہ ان کو بھی پھونک دے برقِ تپاں سے کہدو کہ ان کو بھی پھونک دے
دو چار تنکے اور مرے آشیاں کے ہیں

اب تک سُنا تو سنئے بیانِ غم و الم زحمت ضرور ہوگی مگر کیجئے کرم
مُنہ پھیرنے کی آپ نہ کھائیں ابھی قسم سُن لیجئے انہیں بھی۔ ہوا کیا مآلِ غم
تھوڑے سے اور فقرے مری داستاں کے ہیں

راحت ملے گی خاک تہہ آسماں کہیں خالی کہاں فساد سے دو ہاتھ بھی زمیں
اس کا نہیں یقیں ہمیں اُس کا نہیں یقیں کیسی حیات کس کی اجل ماہرِ حزیں
پیشِ نظر فریبِ طلسمِ جہاں کے ہیں

علّامہ اقبال

(از جناب شہزادہ احمد علی خاں درّانی، سابق ڈائرکٹر جنرل افغان اکیڈمی، کابل)

۱۸۵۷ء[1] میں مغلوں کا اقبال اسلامی اقتدار کو ہندوستان کی خاک میں ملاتا ہوا، دلّی سے اُٹھ گیا، لیکن ۱۸۷۵ء میں پنجاب نے پھر مسلمانوں کو "ظہورِ اقبال" کا مژدہ سنایا۔

نعرہ زد عشق، کہ خونیں جگرے پیدا شد حُسن لرزید، کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت، کہ از خاکِ جہانِ مجبور خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

عالم اسلام کے اس گوہرِ یگانہ کا تعلق خطۂ مردم خیز کشمیر کے اس نو مسلم گھرانے سے ہے جو قدیم آریاؤں کی ایک مقدس شاخ سے جُدا ہوا۔ برہمن، ابتدائے تاریخ سے تا حال حاملِ وید ہونے کے علاوہ اپنے دماغی خصائص، علمی فضائل، سیاست اور معرفت میں مشہور چلے آتے ہیں، اسپر تمام قبائلِ کشمیر پر زبانِ فارسی کے گہرے اثرات اور بالخصوص تصوّف کی بیحد شمولیت نے کشمیری گھرانوں کو تمام ہندوستان میں زبانِ فارسی اور تصوّفِ شرق کا مرکز بنا دیا ہے۔ لہٰذا معمورِ پاکستان کا معصوم بچپن خالص اسلامی تعلیم اور مشرقی تمدّن میں پروان چڑھا۔

اسکول کی پوری تعلیم حاصل کرنے کے بعد مرے کالج سیالکوٹ نے اس جانِ فصاحت کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ جہاں اس نے الیف۔ اے تک کی تعلیم اور علوم مروّجہ کے علاوہ "ادبیاتِ فارسی" کو میر حسن[2] مرحوم سے حاصل کیا۔ اقبال اپنی تعلیمات میں شروع ہی سے نمایاں کامیابیاں حاصل کرتا چلا جاتا تھا۔

اس کی طبع خداداد ابتدا ہی سے موزوں تھی، اس پر استادِ کامل کی پوری توجہ نے گلستانِ خزاں رسیدہ کے اِس نونہال کی شمیم تخیّل کو زبانِ شعر میں سمو کر رکھدیا۔ پھر پروفیسر آرنلڈ جیسی فاضل شخصیت[3] نے اس کو عربی اور فلسفہ کے نکات سے آشنا کیا، پنجاب یونیورسٹی ہی کو اس کے امتحانِ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی کامیابی کا فخر حاصل ہے۔ علّامۂ اقبال، تھوڑی مدت میں بہت سی شہرت کے مالک ہو گئے، اور سب سے پہلے لاہور کے گورنمنٹ کالج میں تعلیمِ فلسفہ پر مقرر کئے گئے۔

۱۹۰۵ء میں ایشیا کا یہ انمول موتی، علومِ عالیہ کی درخشانی حاصل کرنے کے لئے اُفقِ یورپ پر چمکا، جہاں جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور لندن سے قانون کی ڈگری حاصل کر کے ہندوستان واپس آ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کی شہرتِ علم اور صیتِ فضل و کمال نے اس کو "سر" کے خطاب سے سرفراز کیا۔

اقبال کی خصوصیاتِ شاعری پر ایک طائرانہ نظر:-

اقبال کو بچپن ہی سے حاضر جوابی[4] ودیعت کی گئی تھی، اور شعر و ادب کا جمالیاتی ذوق، خداداد[5] تھا۔ اس کا کلام، مراحلِ ابتدائیہ ہی میں، حُسنِ ادا، نُدرتِ تخیّل، اور جذباتِ عالیہ کی مستیوں سے سرشار نظر آتا ہے۔ چنانچہ کنارِ آب، نمودِ ساحل، دلِ صحرا، سکوتِ دشت۔ ملاحتِ شام، صباحتِ صبح، لیلئے شب، درخشانیِ انجم، حُسنِ کواکب، اور اشراقاتِ صبح گاہی کی پُر کیف دلفریبیوں کو، کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہر پڑھنے والا مناظر کی معطر رنگینیوں اور طوفانِ تخیّل کی شوخ لہروں میں بہے چلا جاتا ہے

چونکہ اقبال کی نشو و نما خاندانِ تصوّف[6] میں ہوئی ہے، لہٰذا وہ حُسن کی سحر آفریں اداؤں، اور عشق کی جنوں پرور سرمستیوں میں بھی فلسفۂ عمل کے حقیقی نشاط کو، تصوّف کی گوارا چاشنیوں میں لبساتا ہوا کبھی مولائے رُومؒ کی پاک رُوح میں گھُل مل جاتا ہے، اور کبھی رودِ رُکناباد کے کنارے جدید استعارات اور نئی نئی تشبیہات کے نسرین و نسترن چُنتا ہوا، کشمیر کی جنّت فضا وادیوں میں گنگناتا چلا آتا ہے:-

خوشا روزگارے، خوشا نوبہارے! نجومِ پَرَن رست از مرغزارے
زمین، از بہاران، چو بالِ تدروے ز فوّارہ، الماس بار آبشارے
نہ پیچد نگہ، جُز کہ در لالہ و گُل نہ غلطد ہوا، جُز کہ بر سبزہ زارے

---

[1] ۱۸۵۷ء اور ۱۸۷۵ء، دونوں سنین اتفاقاً تجنیس معکوس کی صنعت میں آ گئے ہیں، یعنی ایک اقبال کا جانا اور دوسرے اقبال کا آنا سنین کی دہائی کے دو عدد کا اُلٹ پھیر ہے۔

[2] پروفیسر سید میر حسن مرحوم السنۂ شرقیہ میں فارسی کے فاضل ادیب اور شہر سیالکوٹ ہی کے باشندے تھے۔

[3] پروفیسر مذکور علم فلسفہ کے متبحر استاد ہونیکے علاوہ ادبیاتِ عرب کے بھی ماہرِ کامل تھے۔

[4] ایک دن جماعت میں دیر سے آنے پر سکول ماسٹر نے پوچھا "اقبال! تم دیر سے آتے ہو؟" جواب دیا "جی ہاں: اقبال، دیر ہی میں آیا کرتا ہے۔

[5] لاہور کے ایک مشاعرے میں ہم جماعت طلبا کے اصرار پر سٹوڈنٹ "اقبال" نے شرماتے ہوئے مصرع طرح پر ذیل کا شعر پڑھ ہی دیا۔

"موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے"

اس پر حاضرین عش عش کر اُٹھے اور حضرتِ داغ بھی جو میر مشاعرہ تھے تڑپ گئے، اُٹھے، اور سینے سے لگا لیا۔ اس کے بعد کچھ مدت تک اقبال، داغ مرحوم سے شعر کی اصلاح لیتے رہے۔ فارسی میں بہت کم عرصہ تک اپنی بعض چیزیں گرامی ہشیارپوری کی نظر سے گزاریں اور علّامہ ہروی کو بھی دکھاتے رہے لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد مشورہ کی ضرورت خود بخود ہی جاتی رہی۔

[6] ان کے والد شہر سیالکوٹ میں کُلاہ دوزی کا کام کرتے تھے، یہ بزرگوار صوفی منش اور زبانِ فارسی سے آشنا تھے۔

Taj Tahir Foundation

لب جُو، خود آرائی غنچہ دیدی؟ چہ زیبا نگارے! چہ آئینہ دارے!
نواہائے مرغ بلند آشیانے در آمیخت با نغمۂ جوئبارے
تو گوئی، کہ یزداں بہشت بریں را نہاد است در دامن کوہسارے

(اقبال)

جگنو کے بارے میں انوکھی تشبیہات ملاحظہ ہوں:۔

واماندہ شعاعیکہ گرہ خورد و شرر شد
از سوزِ حیات است، کہ کارش ہمہ زر شد
دارائے نظر شد

پروانۂ بیتاب، کہ ہر سو تگ و پو کرد
بر شمع چنان سوخت، کہ خود را ہمہ اُو کرد
ترکِ من و تو کرد

یا اختر کے ماہ مُبینے، بہ کمینے
نزدیک تر آمد، بتماشائے زمینے
از چرخ برینے

اقبال، رفعتِ خیال اور نزاکتِ بیان میں، شوکتِ بخارائی اور مرزا بیدل دہلوی کی یاد تازہ کرتا ہے، اور کبھی جوانانِ وطن کو اپنا "درسِ حیات" بوستان کی واقعہ نگار زبان، اور بلبلِ شیراز کے خوش الحان حُسنِ تخاطب میں دیتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو!۔

"پندِ باز با بچۂ خویش"

تو دانی کہ بازان زیک جوہر اند
دلِ شیر دارند و مُشتِ پر اند
نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش!
جسُور و غیور و کلان گیر باش!
میامیز با کبک و تورنگ و سار!
مگر اینکہ داری ہوائے شکار
چہ قومے؟ فرومایہ ترسناک
کُند پاک منقار خود را بخاک
شد آن باشہ نخچیرِ نخچیرِ خویش
کہ گیرد ز صید خود آئین و کیش
بسا شکرہ افتادہ بر روئے خاک
شد از صحبتِ دانہ چینان ہلاک
نگہدار خود را و خورسند زی
دلیر و دُرشت و تنو مند زی
تنِ نرم و نازک بہ تیہو گذار
رگ سخت چون شاخِ آہو بیار
نعیبِ جہان آنچہ از خرمی ست
ز نگینی و محنت و پُر دمی است
چہ خوش گفت فرزندِ خود را عقاب
کہ یک قطرۂ خون بہتر از لعلِ ناب
مجو انجمن مثلِ آہو و میش!
بخلوت گرا چون نیاگانِ خویش
چنین یاد دارم ز بازانِ پیر
نشیمن بشاخِ درختے مگیر!
کنامے نگیریم در باغ و کشت
کہ داریم در کوہ و صحرا بہشت
زروئے زمین دانہ چیدن خطاست
کہ پہنائے گردون خدا دادِ ماست
بخیبے کہ پا بر زمین سُودہ است
ز مُرغِ سرا سفلہ تر بودہ است
پئے شاہبازان بساط است سنگ
کہ بر سنگ رفتن شود تیز چنگ

تو از زردچشمانِ صحرا استی
بگوہر چو سیمرغ والا استی
جوانے اصیلے کہ در روزِ جنگ
بر دم مردُمک را ز چشمِ پلنگ
بہ پروازِ تو سطوتِ نُوریان
بہ رگہائے تو خونِ کافوریان
تہِ چرخ گردندہ کوژپُشت
بخور آنچہ گیری ز نرم و دُرشت

اقبال، مثالیہ میں غنیؔ کاشمیری، اور صائبؔ اصفہانی، کی ہمنوائی کرتا ہے اور کبھی اپنے پیمانۂ تغزل کو فیضیؔ، عرفیؔ، نظیریؔ، کلیمؔ اور سلیمؔ کے رنگ میں بھرتا ہے۔ جس میں جانِ جاناں کا سوز اور نورالعین کی صفائی جھلکتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فلسفۂ حیاتِ اقوام، کی تعلیم، اور تاریخ تفضلِ اُمم، کے درس کو الٰہیات کے جام و ساغر میں بھر بھر کر محافلِ افسردہ کو گرمائے چلا جاتا ہے، کیونکہ عوارضِ ملل کی تشخیص میں اسے یدِ طولیٰ حاصل تھا۔

علامۂ ممدوح کا کلام، ثقالت سے تو مُبرّا ہے۔ لیکن بادی النظر میں اس کے فلسفہ کی گہرائیوں اور تخیّل کی بلندیوں سے عبور کرنا کچھ آسان کام بھی نہیں، کیونکہ فارسی محاورات کے باریک کنائے اور زبانِ شعری[2] کی جامعیّت اور حُسنِ اختصار سے استادِ شاعر کا اندازِ بیان، اپنے ہر پہلو دار نکتے میں، حقائق و معارف کا ایک طوفان لئے رہتا ہے۔ بقول مرزا بیدل:۔

معنئ بلندِ من فہمِ تُند مے خواہد
سَیرِ فکرم آسان نیست، کوہم و کُتل دارم

اقبال کا درسِ حیات

اقبال نے، شروع ہی میں انحطاطِ عالمِ اسلام کے اسباب و علل، اور اضمحلالِ ملت کے مُوجبات و عوامل، پر نظرِ غائر ڈالی۔ افتراق و انفکاکِ قوم، پستئ ملت، معائبِ اخلاقِ قومی، افرادِ ملت کی بے حسی، زوالِ مفاخرِ اسلامی، بالخصوص قائدین کے جمُود، اور رہنماؤں کی بے راہ رَوی نے اس کے پیمانۂ صبر و شکیب کو چھلکا دیا، جس سے اس کے جگر دوز نالے، اور سینہ سوز آہیں، کلام کی دلنشینیوں اور جذبات کی شوخیوں میں ڈھل کر، پہلے ہندوستانی اور پھر فارسی زبان میں ساری دنیا پر چھا گئیں۔

عشق؛ پامالِ خرد گشت و جہاں دیگر شد
بُود آیا کہ مرا رخصت آہے بخشند! (اقبال)

کاروانِ ملت کا یہ حُدی خوان، سعی و عمل کے رستے کی اُلجھنوں کو، اپنے حُسنِ بیان سے سُلجھاتا، مظاہرِ قدرت اور نوامیسِ فطرت کے جلوے دکھاتا، کاروانِ از پا در اُفتادہ، کے تھکے ماندہ افراد، اور مغرب زدہ مبہوت ہستیوں کو جگا کر انھیں اخوتِ اسلام کی ایک ہی زنجیر میں کھینچے لئے جاتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اپنی "نوائے[3] تلخ" میں اتنا سوز پیدا کر دے جو ملت کے امن و سکون کے لئے صاعقۂ آتش بار سے کم نہ ہو۔ اس کا "درسِ تصوّف" بھی اک "فرازِ عمل" ہے، اور تعلیمِ خودی ایک مستقل نظریۂ حیات"۔ اقبال، "ماضی کا مورّخ" ہے، اور "استقبال کا مُبصّر" جو ہمیں معرضِ حیات

[1] مال ہاتھوں سے گیا، ملت کی آنکھیں کھُل گئیں
سُرمۂ چشم دشت میں گردِ رمِ آہو ہوا (اقبال)
ز خاکِ کشتۂ چشمِ تو خیزد محشرِ شوخی
رمِ آہو، شہیدانِ ترا تارِ کفن باشد (شوکت بخارائی)

[2] زبانِ فارسی تمام مشرق کی ہمہ گیر زبان ہونے کے علاوہ "زبانِ شعر" کہلاتی ہے، جس طرح ہندوستان میں "برج بھاشا" کو "زبانِ موسیقی" کا درجہ حاصل ہے۔

[3] اثر در غنچہ ہا از خواب، اگر چیزیست، اے بلبل! (ترجمۂ فارسی از طلوعِ اسلام)
نوا را تلخ تر می زن: چو ذوقِ نغمہ کم یابی۔ حُدی را تیز تر میخوان: چو محمل را گران بینی (عرفی شیرازی)

میں اپنے مذہب کی دلبرانہ عالمگیری پر فخر کرنا بھی سکھاتا ہے۔

اقبال، ملتِ اسلامیہ کا سیاسی شاطر ہے، جو اپنے کلام کے انقلابی مُہروں کو عموماً فلسفہ اور الٰہیات کی بساط پر، بڑی مہارت اور شطارت سے چلتا اور ہر خطرے سے دامن بچا کر چلتا ہے۔

اقبال، ایک طرف تو اس عالمِ جد و جہد، اس عرصۂ کون و فساد، اور اس میدانِ تگ و تاز میں شاعروں، ادیبوں، مورّخوں، فلسفیوں، باریک بینوں، نکتہ چینوں اور سیاستمدار لیڈروں سے دست و گریباں ہو رہا ہے، اور دوسری جانب اپنی جمعیتِ پریشاں کے بکھرے موتیوں کو وفاق و اشتراک کی لڑی میں پرو کر، "توحیدِ عمل" اور "حُسنِ سلوک" کے سیدھے اور اسلامی رستے کی ہدایت کئے جاتا ہے۔

اقبال کا فلک پیما تخیل "ڈانٹے[1]" کی طرح "ہومر[2]" کی اندھی رہنمائی میں جہنم کے اسفل السافلین طبقات کی سیر نہیں کرتا، بلکہ مولینائے رومؒ کے مشعلِ فیض کی سُہانی تنویرات میں ہفت افلاک[3] کی ملکوتی فضاؤں میں اُڑا چلا جاتا ہے۔

ملتِ اسلام کا یہ اَن تھک راہ رَو سپاہی، فلمی گھرانے کے کنھک اور مداری کوُیوں میں سے نہیں جو اپنی قیدِ بے زنجیر کا بھی احساس نہ کرتے ہوئے خسوفِ شمس کے روز سورج کے نجات کی دعا مانگتے، اور اس کے چھٹکارے کے لئے بُرَت رکھتے پھرتے ہیں۔

"ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا"

اسلام کا یہ سپوت، اُن سکوت آشنا، جمود پرور، تعیش پسند، تخیل پرست، اور راگ رسیا شاعروں میں سے بھی نہیں جو اپنی ملت کو سحر شاعری کی مسحور کن تاثیر، اور ناممکن الحصول، دقیانوسی بے بنیاد تخیلات کے اثر سے شکست، بے حس اور مبہوت بنا دے۔ وہ جوگی شکل، سہجیہ مسلک کے ناگ راہب، شاعر جو عالمِ حیات، اور یکہانِ زندہ کو موت کے سکون، بیخودی کے جمود، تعیش کے غنود، مظلومیت، دلشکستگی اور بے معنی افسردگیوں سے آشنا کر رہے ہوں۔ اقبال، تو یہاں تک چاہتا ہے کہ غلط راہِ توکل اور مسلکِ قناعت کی اس دل شکن تعلیم کو بھی یکسر فنا کر کے رکھ دے۔ جس کو مشرق کے بعض متصوف ادیبوں اور اکثر مظلوم شاعروں نے عملی زندگی کے صاف رستے کی بھُول بھُلیاں بنا دیا ہے۔ بلکہ اقبال تو اپنے ساز کے سوز سے محفلِ خاموش کے ہر افسردہ چراغ کو اک پروانۂ بیتاب بنا دینا چاہتا جس کے لئے کشاکشِ سعی و عمل کے رستے میں کوئی منزل گاہ نہ ہو۔ کوئی قرار گاہ نہ ہو، وہ کہیں پر نہ تھمے، کسی جگہ نہ رُکے، اُسکو کوئی چیز جلب نہ کرسکے۔ بس بڑھے ہی چلا جائے۔ چنانچہ اس کی "حُور اور شاعر" والی نظم ہمارے اس قول کی مؤید ہے:۔

حُور و شاعر

حُور:۔۔۔ نہ بہ بادہ میل داری نہ بمن نظر کشائی
عجب اینکہ تو ندانی رہ و رسمِ آشنائی

ہمہ سازِ جستجوئے، ہمہ سوزِ آرزوئے،
نفسے کہ میگدازی، غزلے کہ می سرائی
بنوائے آفریدی چہ جہانِ دلکشائے،
کہ ارم بچشم آید چو طلسمِ سیمیائی

شاعر:۔۔۔ دلِ رہرواں فریبی بکلامِ نیش دارے
مگر اینکہ لذّتِ او نرسد بنوکِ خارے
چکنم کہ فطرتِ من بمقام در نسازد
دلِ ناصبور دارم چو صبا بلالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے
تپد آن زمان دلِ من پئے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے
سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایت آن، کہ نہایتے ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبے، بہ دلِ امیدوارے
دلِ عاشقان بمیرد بہ بہشت جاودانی
نہ نوائے دردمندے، نہ غمے، نہ غمگسارے

اقبال، اپنے کلام، اپنے سبق، اور اپنے درسِ عمل سے چاہتا ہے، اقوامِ مفلوج کے عروق و شرائین میں جوان خون دوڑا دے، سینے کو برما دے، اور دل کو تڑپاتا ہی چلا جائے۔ اس کا "درسِ حیات" وہ جوہرِ زندگانی ہے جو اقوامِ مردہ کی ہر رگ و پے میں زندگی کی برقی لہریں دوڑاتا ہے، کیونکہ افرادِ ملت کی انفرادی قوتِ ارادی میں حرکت اور اضطرار کی بیقرار موجوں کو اُچھالے چلا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ نے اپنے اسی عقیدے کا ایک جگہ انگریزی میں بھی اظہار فرمایا ہے، جو ہماری ناقص رائے میں ہر فردِ ملت کے ورقِ پارۂ دل پر روشن اور تابناک حروف میں لکھ رکھنے کے قابل ہے۔ تاکہ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ فرماتے ہیں:۔

"آدمی کی تمام جد و جہد کا واحد انجام صرف "زندگی" ہے، اور کچھ نہیں، سب علوم و فنون اسی "مقصدِ واحد" کے حصول کے لئے بروئے کار لائے گئے ہیں، لہٰذا ہر علم و فن کا فائدہ اس کی "قوتِ حیات" ہی سے جانچا جا سکتا ہے۔ مثلاً، اعلیٰ ترین فن وہی ہے، جو ہم میں "جبلی قوتِ ارادی" پیدا کرے، اور ہمیں معرکۂ حیات، اور کارزارِ زندگی میں "مقابلہ" کی طاقت بخشے۔ اس کے برعکس، تمام "خواب آور اثرات[4]" جو درحقیقت ہمیں تعلیم گریز دیتے ہیں۔ وہ بناتِ خود ہمارے

[1] اٹلی کا ایک شاعر، جو اپنے دل آزار تخیل کو، ہومر کی راہنمائی میں، دوزخ کے طبقات کی سیر کروے جاتا ہے۔

[2] یونان کا مشہور، اندھا شاعر، "ایلیڈ" کا مصنف۔

[3] ڈانٹے کے جواب میں اقبال نے اپنے تخیل کی پرواز ہفت افلاک میں دکھائی ہے، اور ہر فلک کا جدا جدا سماں باندھ کر وہاں کے ساکنین کی زبانی اہلِ زمین کو نصیحت آمیز پیغامات پہنچائے ہیں۔ اقبال اپنی اس سیرِ ہفت افلاک میں مولائے رومؒ کو اپنا رہبر بناتا ہے۔

[4] سوزناک اور غمگین موسیقی (ہندی راگ) مغموم مصوری (جس سے غم اور افسوس کے نتائج نکلیں، اجنتا غار کے اندر کی بعض تصویریں) مظلومانہ اور دلشکن شاعری جو عمل کے رستے میں آدمی کو شکست اور مبہوت بنا دے۔ پیسیمسٹک ادبیات، مؤثر ٹریجیڈی، جوگ، بروگ، اور تانترک فلسفہ وغیرہ

"انحطاط و اضمحلال کا پیغام" اور ہماری "موت کا سند لیا" ہیں۔ لہذا ادبیات کا دامن "تشیلی دنیا کی سکون افزا الائش" سے پاک ہونا چاہیئے، "اعلوللفن" کا اصول بھی، عہدِ تنزل ہی کی اختراع ہے، جو ہمیں اپنے "مقصد" یں "جذبۂ عمل" اور "ذوقِ حیات" سے محروم کرتا ہے۔ (اقبال)

درسِ خودی :۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ علامہ اقبال کو یورپ کے عمیق مطالعہ نے جہاں جذباتِ انسانی کا مصور اور احساساتِ بشری کا پورا پورا مفسر بنا دیا، وہاں وہ مشرق کی تدبیر منزل میں بدیشی نظریات کے بائیکاٹ کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اقبال کا درسِ خودی اپنے زورِ بازو پر توقع رکھتا ہے، وہ غیر کی امداد اور اعانت میں اپنی ذلت و اہانت محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

موسیائی خواستن نتوان، شکستن میتوان

بہتر ے رسد آن بتے، کہ خود نگر است

مُرید پیرِ خراباتیاں خود بین شو! نگاہِ او، ز عقاب گرسنہ تیز تر است

ز خاکِ خویش طلب آتشے، کہ پیدا نیست تجلّیٔ دگرے، در خورِ تماشا نیست

آتش از نالۂ مرغانِ حرم گیر و بسوز! آشیانے کہ نہادی بہ نہالِ دگران

مکتبِ اقبال کا درس اور اس کے سکول کی تعلیم، تربیتِ انفرادی، اور نظامِ اجتماعی، کا کھلا فلسفہ ہے، اس میں بھی اقبال اپنی طرزِ ادا، اور اندازِ تخیل میں جدتیں پیدا کرتا ہوا "حرکت" اور "عقانیت" سے لبریز پیمانے تقسیم کئے جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی "نفاق" اور "بے مروتی" کے بُرے انجام کو کبھی جانوروں کی زبان سے، کبھی حیروماہ، اور کبھی دوسرے اجرامِ فلکی کی وساطت کے نرالے طریقوں سے ملت کے کانوں تک پہنچاتا ہے، اور ڈرائے جاتا ہے چنانچہ ایک جگہ نفاق سے پُر، لیکن حرکت سے خالی، اقلام آباد دنیا کے دہشتناک حال کو، چاند کی زبانی ذیل کی خوفناک تشبیہات میں یوں بیان کرتا ہے:۔

شورہ بوم، از نیشِ کژدم خار خار   موبراد، اژدر گز و عقرب شکار

صرصراو، آتشِ دوزخ نژاد   زورقِ ابلیس را، بادِ مُراد

آتشے، اندر ہوا غلطیدۂ   شعلۂ، در شعلہ پیچیدۂ

آتشے، از دودِ پیچان تلخ پوش   آتشے، تند رغو و دریا خروش

در کنارش، مارہا اندر ستیز   مارہا، با کفچہ ہائے زہر ریز

شعلہ اش، گیرندہ، چون کلبِ عقور   ہولناک و زندہ سوز و مُردہ نور

اے خدا! چشم کبود و کور بہ!

اے خدا! این خاکدان بے نور بہ!

ۛ۱ تعلیم کو۔ صرف علم حاصل کرنے کے لئے پڑھنا، نہ کہ عملی دنیا کے فوائد کے لئے۔

ۛ۲ مقتبس از سینو اپما!

اقبال نے، سید جمال الدینؒ افغانی کی ہمنوائی میں، تمام عالمِ اسلام کو "امتیازِ ملت و وطن" (یعنی قیودِ ملی، اور نہایتِ مکانی) کے نواقصات سے آگاہ کر کے "توحیدِ مطلق" اور "ذوقِ وحدت" کے صحیح راستے پر لانا چاہا ہے۔ اس کی انتہائی آرزو ہے کہ تمام گھنڈی پٹی مسلم قومیں یکجان ہو کر عالمِ اسلام کے لئے ایک "قلبِ مشترک" اور ایک "وجودِ واحد" کا کام دیں۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

قلبِ ما، از ہند و رُوم و شام نیست   مرز بُومِ او بجز اسلام نیست

اور اپنی اس آرزو کی تکمیل کو کہ:۔

گردشے باید، کہ گردُون از ضمیرِ روزگار   دوشِ من، باز آرد، اندر کسوتِ فردائے من

صرف قرآن ہی کی پیروی میں دیکھتا ہے، اور بس۔

گر تو میخواہی مسلمان زیستن   نیست ممکن، جُز بقرآن زیستن

دل بہ سلمئ عرب باید سُپرد   تا دمد صبحِ حجاز، از شامِ کُرد

آند کے از گرمئ صحرا بخور!   بادۂ دیرینہ از خُرما بخور!

اقبال، فرد و ملت کی رہنمائی کرتا ہوا، اس کو "ذوقِ طلب" اور "تلاش" کے رستے میں، بے راہی کی ٹھوکروں سے بھی آگاہ کئے جاتا ہے، اور کہتا ہے:۔

ترسم، اکہ تو میرانی، زورق بہ سراب اندر   زادی بحجاب اندر، میری بحجاب اندر

چون سُرمۂ "رازی" را، از دیدہ فروشستم   تقدیرِ اُمم دیدم، پنہان بکتاب اندر

برگشتِ وخیابان پیچ! بر کوہ و بیابان پیچ!   برقیکہ بخود پیچد، میرد بہ سحاب اندر

بے دردِ جہانگیری، آن قُرب میسّر نیست   گلشن بہ گریبان کش! اے بُو بہ گلاب اندر

اقبال، خدا سے اپنے کلام میں، اس قدر تاثیر کا طالب ہے کہ اجسادِ خفتہ کو اپنی "از خوابِ گران خیز!" کی کڑک سے بیدار کر کے "جستجو" اور "تلاش" کے رستے پر سرگرمِ عمل بنا دے تاکہ اسلام کے خزان رسیدہ باغ میں پھر سے بہار آجائے، اور اس چمن میں از سرِ نو نکہتیں اور شادابیاں جھومتی پھریں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

ایک زمن فزدہ ای گرمئ آہ و نالہ را!   زندہ کُن، از صدائے من، خاکِ ہزار سالہ را!

غنچۂ دل گرفتہ را، از نفسم گرہ کشائے!   تازہ کُن، از نسیمِ من، داغِ درونِ لالہ را!

اشکِ چکیدہ ام ببیں! ہم بہ نگاہِ خود نگر!   ریز بہ نیستانِ من، برق و شرار این چنین!

آخر میں اقبال، عالمِ اسلام سے نا اُمید بھی نہیں، اس کی عقابی نگاہوں نے کشاکشِ اقوام کی موجودہ مد و جزر اور تموجاتِ زمانہ کے تھپیڑوں میں، اس گوہرِ عالم کو متحرک اور پنپتے دیکھ لیا ہے جو صدفِ دہر کے اندر مدت سے بے حس پڑا ہوا تلاطمِ روزگار کے رحم و کرم پر

ۛ۳ اس دور میں پان اسلامزم کا پہلا علمبردار افغانستان میں سمت مشرقی کا رہنے والا عالم، جسکے فضل و کمال سے تہران، مصر، اور قسطنطنیہ بہرہ مند ہوئے۔ انکی عمر کا کافی حصہ وطن سے دور ممالک مذکورہ اور یورپ میں بسر ہوا۔

ۛ۴ قرآن کریم کی تفسیر [illegible] اپنے عہد اور اپنے حیات کے مطابق کر کے بعض مسائل میں حقیقت سے دور جا پڑے تھے۔

جی رہا تھا۔ اس کی بیدار اور بیخواب آنکھوں نے رات کے اندھیرے میں بھی اسلام کے "اختر اقبال" کو آسمان سیاست کی لامحدود پہنائیوں میں ٹمٹماتے دیکھ لیا ہے، جس کی ضیا باریاں بشریت کو ظلم اور وحشت کی گمراہ ٹھوکروں سے نجات دیں گی۔

بخوان از زبر، صداقت را، عدالت را، شجاعت را!   کہ عالم باز می گیرد، زِ تو کارِ امامت را!

اسی لئے وہ "طلب" اور "جستجو" کی راہ میں ہمیں "یاس" کی ممانعت کرتا ہے:۔

در طلب "کوش و مدہ دامنِ امید ز دست   دولتے ہست، کہ یابی سرِ راہے گاہے

(اقبال)

اقبال، موت کے دروازے پر :۔

اسلام کا یہ مایۂ ناز فرزند، وفات سے چار برس پہلے دمہ کے عارضے میں مبتلا ہوا۔ آخری تین مہینے مرض کی شدت کے تھے، کہ ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء میں جمعرات کی صبح کو، ۵ ½ بجے، تریسٹھ برس کی عمر میں، مسلمانانِ ہند کے کاروانِ حیات کو بے صدا چھوڑ گیا۔

اقبال نے، مرتے دم تک اپنے جذباتِ عالیہ اور احساساتِ پاک کے مظاہرے کو نہ چھوڑا، بلکہ موت کی کٹھن منزلوں، بیتاب لمحوں، اور بیقرار سانسوں میں بھی، ذیل کی رباعی سے اپنی آرزوؤں کا اظہار کرتا گیا:۔

سرودِ رفتہ، باز آید کہ ناید!   نسیمے از حجاز آید کہ ناید!

سر آمد روزگارے این فقیرے   دگر دانائے راز آید کہ ناید!

اس معلمِ حیات نے اپنے آخری ہچکولوں میں آخری "درسِ موت" شعرِ ذیل کی صورت میں پہنچا دیا:۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چو مرگ آید، تبسم بر لبِ اوست

اور کلمۂ شہادت پڑھتا ہوا ہم سے رخصت ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن!

تصانیفِ اقبال

علامہ اقبال کی ساری تصنیفات، اور مختلف مضامین[2] پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کرنا، بذاتِ خود ایک مبسوط کتاب کی تدوین کا حوصلہ کرتا ہے[3]۔ ہماری یہ مختصر اور ادھوری سی تحریر فی الحال مکمل نقد و نظر کے بارِ گراں کی متحمل نہیں ہو سکتی، لہٰذا سفر کوہ کی اس بے سروسامانی اور اپنی بے بضاعتی کا عذر پیش کرتے ہوئے، علامہ ممدوح و مرحوم کی مشہور تصانیف پر اڑتی سی نظر ڈالے جاتے ہیں۔

بانگِ درا :۔ اُردو نظم، غزلیات اور اشعار کا وہ رنگین مجموعہ، جس میں علامہ اقبال کے مقدس تاثرات، جوانی کی معطر شوخیوں کے ساتھ دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ یہ مجموعہ اپنے جدتِ تخیل اور حُسنِ ادا میں ایک خاص طرزِ جدید کا رہبر شمار ہوتا ہے۔

بالِ جبریل :۔ اردو زبان کا دوسرا کارنامہ، جس کے پند و نصائح اور عبرت کے تازیانے مرحوم کی پختگیٔ عمر کا پتہ دے رہے ہیں۔

ضربِ کلیم :۔ ہندوستانی زبان کا تیسرا شاہکار، جو اپنے حُسنِ بیان، شگفتگیٔ مضامین اور رفعتِ خیال میں اپنی آپ ہی نظیر ہے۔

اسرارِ خودی / **رموزِ بیخودی** } دو مثنویاں :۔ زبانِ فارسی میں علامہ اقبال کا ابتدائی کلام، جس میں عقانیت اور فلسفۂ حیات بعل، پر مدلل بحث کی گئی ہے۔

پیامِ مشرق :۔ جس میں فارسی شانِ تغزل کی بے پناہ رعنائیوں، اور مشرقی بادۂ تخیل کی دلاویز شیرینیوں میں گوئٹے کے "سلامِ مغرب بہ مشرق" کا مؤدب جواب بھر دیا گیا ہے۔

زبورِ عجم :۔ فارسی میں محاسنِ شعری اور حُسنِ ادب کا حسین مرقع، جس میں انقلابِ اُمت کے بادۂ اقبال کی پُرجوش سرمستیاں اور "درسِ حیات" کا خونین جوہر، "انقلاب! اے انقلاب!" کی برہم صداؤں میں چھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کتاب اقوامِ مشرق کے لئے اسم با مسمیٰ ہے۔

جاوید نامہ :۔ اپنے بیٹے "جاوید" کے نام پر، اس میں بھی بالعموم ساری ملت کو خطاب کیا گیا ہے۔ علاوہ بہت سی خوبیوں کے اس کی خصوصیت اٹلی کے دشمنِ اسلام شاعر "ڈانٹے" کے ایک دل آزار تخیل کا حسین جواب ہے، جس میں رُوحِ اقبال، مولانائے رُوم جیسے منور اور پاک رُوح کی قیادت میں ہفت افلاک کی ملکوتی سیر سے ملت کو عبرت و اعتبار کے نایاب درس دے رہی ہے۔

مسافر۔ فارسی میں چند اوراق کی مختصر کتاب جسمیں سیاحتِ افغانستان پر اپنے دلی تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے۔

ارمغانِ حجاز۔ چند ورق جو علامہ اقبال کی عقیدت و آرزوؤں کا مختصر سا نمونہ اور انکی آخری یادگار تحریر ہے،

اقبال اور افغانستان

اقبال کو ممالکِ اسلامی میں سب سے زیادہ خاکِ پاکِ افغانستان کے ساتھ دلچسپی تھی، اس کی سرور اُمیدیں اور سنہری آرزوئیں رُستم و سُہراب کی اسی سرزمین سے وابستہ تھیں، اور وہ اپنے اظہارِ جذبات کے لئے وہیں کی زبان[5] لیکر آیا تھا۔

اس کے سینے میں احمد شاہ درانی کا دل تھا جس میں جمال الدین افغانی کے عقاید چھلک رہے تھے۔ اس کے منہ میں ثنائی[6] کی زبان تھی، اور سر میں خوشحال خاں خٹک[7] کے خیالات، اس کی تعلیمات بھی وہی ہیں جو افغان مائیں ہمیشہ اپنے فرزندوں کو پشتو کے اِن خیالات میں دیا کرتی ہیں۔

پہ جنگ کے شہید نسوے زما لالیہ !   پہ بے ننگی کے، دَساتہ پینہ

خال، پہ دَیار، پہ وینو کیشرم   چہ پہ شینکے باغ گل گلاب شرمونہ

ۛ۱ علامہ اقبال کے "طلوعِ اسلام" کے فارسی منظوم ترجمہ کا ایک شعر جو بوقت فرصت چھاپ دیا جائیگا۔

ۛ۲ علامہ اقبال نے علاوہ فارسی اور اردو کی مشہور کتابوں کے اور مضامین بھی انگریزی زبان میں لکھے ہیں، جن میں سے کچھ ترجمہ ہو چکے ہیں۔ جیسا کہ "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" مولانا ظفر علی خاں کا اردو ترجمہ۔

ۛ۳ جو زیرِ غور ہے، اور ساتھ ہی اس کے بعض حصہ کلام کی تشریحات بھی مدِ نظر ہیں۔

ۛ۵ زبانِ فارسی کی نشأت، دراصل افغانستان ہی سے ہوئی ہے، نہ کہ ایران سے، صاف ظاہر ہے کہ آئینِ زردشتی اور زبانِ فارسی کا منبع ترکستانِ افغانستان، اور بلخ ہی کی سرزمین ہے۔ افغانستان میں علاوہ اور بہت سی زبانوں کے، فارسی اور پشتو کا عام رواج ہے، اور یہ نکتہ فارسی کے اُن رموز دانوں سے پوشیدہ نہیں، جو ایرانی، افغانستانی، تاجیکی (بخارائی) اور ہندوستانی فارسی کے سبکوں (سکولوں) سے خوب آشنا ہیں، کہ اقبال کی فارسی، اتفاقاً یا کسی طریقے سے تقریباً بیک افغانستان کی فارسی ہے، نہ کہ باقی تین سبکوں میں سے کسی ایک کی۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Taj Tahir Foundation

اقبال بھی قوم میں انھیں تعلیمات کو، ترزیق کئے جاتا ہے، اور کہتا ہے :-

اگر خواہی حیات، اندر خطر زی!

دمادم خویشتن را، بر فساں زن! | ز تیغ پاک گوہر تیز تر زی!

نکو شیوہ و پختہ تدبیر باش! | جسور و غیور و کلان گیر باش!

لہٰذا معرکۂ عمل، اور رزم حیات کا یہ مجاہد، معنوی لحاظ سے پورا پورا "پٹھان" تھا جس کی پُرحرارت آرزوئیں، ایشیا کے اِن سرگرم عمل، غیور افغانوں کے "مفاخرِ ملی" کی ہمنوا ہیں۔ یہاں پر ہم ضمناً، ملتِ افغان کے نام، اس کے ایک پیغام کو جس کی اشاعت کا فخر "انجمن ادبی" کے ماہوارہ "مجلۂ کابل" کو حاصل ہوا، قندِ مکرر کہکر صفحاتِ ادیب کے حوالے کرتے ہیں۔ اور اس اصلی خطے کے فوٹو کو جو انکے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، تبرکاً بطور یادگار اسی رسالہ میں شائع کئے دیتے ہیں۔

"پیامِ اقبال، بملتِ کوہسار"

صبا! بگوئے! بافغانِ کوہسار از من | بمنزلے رسد آن ملتے، کہ خودنگر است

مُرید پیر خراباتیانِ خود بین شو! | نگاہِ او، ز عقابِ گرسنہ تیز تر است

ضمیر تست، کہ نقشِ زمانۂ تو کشد | نہ حرکتِ فلک است این، نہ گردشِ قمر است

دگر بسلسلۂ کوہسارِ خود بنگر! | کہ تو کلیمی و تنسیخ تجلئے دگر است

بیا! بیا! کہ بداماں نادر آویزیم | کہ مرد پاک نہاد است و صاحب نظر است

آخر وہ دن بھی آگیا جب ملتِ اسلامیہ کا یہ آریائی سپوت، ہندوستان کے دو گوہرانِ گرانمایہ کے ساتھ ایشیا کے قلب (کابل) میں تشریف لے آیا۔ پادشاہ اور وزرا کی ملاقاتیں فضلا اور ادیبوں کی مجلسیں جب یاد آتی ہیں تو کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہوں۔

وہ رات بھلائی نہیں جاسکتی، جب انجمنِ ادبی کی طرف سے ان کے خیر مقدم میں ایک جلسہ ہوا جس میں تقریریں ہوئیں اور خطابے پڑھے گئے، سرراس مسعود (مرحوم) علامہ سید سلیمان ندوی، پروفیسر ہادی حسن، اور دوسرے فضلائے افغان کے علاوہ حضرت اقبال بھی بولے، اور خوب دل کھول کر تقریر کی۔ اسلام کی آزاد سرزمین اور افغانوں کے بے کھٹک رہنے میں، نوجوانانِ وطن کو خطاب کرتے ہوئے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔ ان کے وہ آخری فقرے نہیں بھولتے، جب کہا کہ :-

"فضلائے افغانی اور ادیب، اپنے جوانوں میں یہی رُوح اور بھی پھونکتے جائیں، جس سے یہ ملتِ شجاع اپنی "خودی" سے زیادہ آشنا ہو کر دنیا کو علی الاعلان کہدے۔

دو دستہ تیغم و گردون برہنہ ساختہ مرا | فسان کشید، و بروئے زمانہ آختہ مرا"

نادر شاہ شہید، مردِ شمشیر اور صاحبِ تدبیر ہونے کے علاوہ علم و ادب سے بہت لگاؤ رکھتے تھے، اور بقول علامۂ مرحوم "عصرِ حاضر کی بحرِ سیاست کے پختہ کار شناور تھے"۔

ملتِ اسلام کا نفاق، اقوام کا افتراق، دولِ ایشیا کی خود غرضیاں، اور عالمِ اسلامی کی پسماندگیاں، ان کے دل پر اتنا گہرا اثر رکھتی تھیں کہ موضوعاتِ مذکورہ پر تبادلۂ خیالات فرماتے وقت، اس صاحبِ عزم و ہمت کی پُرنم آنکھیں، عالمِ اسلام کی پریشانیوں کے تاثرات کی غمازی کر دیتی تھیں۔ لہٰذا علامہ اقبال جیسے فنا فی القوم ادیب، کی قدر و منزلت، جتنی کہ اس فاتحِ روزگار کے دل میں تھی، اس کا بیان تحصیل حاصل ہے، اور علامہ اقبال جیسا مخلص اسلام، تو پہلے ہی سے اس مردِ یگانہ کے کارناموں کا مداح تھا۔ چنانچہ کہتا ہے،

نادر، آن سرمایۂ دُرّانیان | آن نظامِ ملتِ افغانیان

از غمِ دین و وطن زار و زبون | لشکرش از کوہسار آمد برون

ہم سپاہی، ہم سپہ گر، ہم امیر | با عدو فولاد، و بایاران حریر

من فدائے او، کہ خود را دیدہ است | عصرِ حاضر را نکو سنجیدہ است

بیا! بیا! کہ بداماں نادر آویزیم | کہ مرد پاک نہاد است و صاحب نظر است

مشرق کے اس مردِ مجاہد، اور اولوالعزم بادشاہ کی شہادت پر، افغانستان جیسے ملک میں کسی ایک کی نکسیر تک نہ پھوٹنا، ہمت و ران عالی ہی کی دور اندیشی، اور تدبر کا نتیجہ تھا، اور بڑی بات تھی۔ ساتھ ہی "ظاہر شاہی" دور کی ترقیاں، مفید کارنامے، اور جہان شمول سیاست، نے بھی علامۂ ممدوح کے دل پر گہرا اثر ڈالا، چنانچہ حکومت موجودہ کے بارے میں اپنے عواطف کا یوں اظہار فرمایا ہے :-

اے قبائے پادشاہی بر تو راست | سایۂ تو خاک ما را کیمیا ست

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

۴ حکیم سنائی غزنوی، آلِ ناصر کا وہ معروف اور شہرۂ آفاق شاعر جس نے سب سے پہلے شعر فارسی میں تصوف کی آمیزش کی۔ علامہ اقبال کو ان سے بھی بہت عقیدت تھی۔ چنانچہ غزنی میں زیارت "حکیم سنائی صاحب" پر گھنٹوں بیٹھے کسی درونی تاثرات کی وجہ سے رو دیا کئے۔

۵ پشتو زبان کا آتش بیان قومی شاعر جس کے خود علامہ اقبال بہت مداح تھے (خدا نے چاہا) تو اس افغان شاعر کے کلام ارغد کی خوبیوں اور اس کے ملت پرور تخیلات اور جذباتِ پاک سے اردو ادب کو روشناس کرایا جائے گا۔

۶ (ترجمہ) میرے لال! اگر تو لڑائی میں شہید نہ ہوا، تو بے عزتی کے ساتھ زندگی بسر کرے گا۔ میں تو اپنے منگیتر کے خون سے (اپنے) ماتھے پر بندی لگاؤں گی، تاکہ ہرے بھرے باغ میں، گلاب کا پھول (اس کی پاکیزگی، نزاکت اور مقدس شوخیوں کے سامنے شرما جائے۔

۷ "آریانہ" (ہرات) "آریہ" قوم کا اصلی گہوارہ، کوہستان کابل سنسکرت اور "رگ وید" کی سر زمین اور مشرقی افغانستان مشہور عالم "پانی" کا وطن لہٰذا افغانستان ہی صحیح معنوں میں وہ خطہ مانا جا رہا ہے جہاں سے آریا کشور کشاؤں کے جتھے ایران، ہندوستان، کشمیر اور یورپ کے ممالک میں پھیل گئے، چونکہ علامہ اقبال بھی کشمیر کے اعلیٰ آریہ نسل میں سے تھے لہٰذا افغانستان بلکہ تمام آریا قوم کو اپنے اس شخص خفیہ پر بجا ناز ہو سکتا ہے۔

۸ سرراس مسعود (مرحوم) اور مولینا سید سلیمان ندوی

۹ خود علامۂ ممدوح نے کئی جگہ شہر کابل کو پیکر ایشیا کا دل کہا ہے۔

۱۰ علامہ اقبال نے "من فدائے او کہ برخود را دیدہ است ؛ عصرِ حاضر را نکو سنجیدہ است" اور "کہ مرد پاک نہاد است و صاحب نظر است" انہیں کے لئے کہا ہے۔

خسروی را، از وجودِ تو عیار | سطوتِ تو، ملک و ملت را حصار

سینہ ہا، بے مہر تو، ویرانہ بہ | از دل و از آرزو بیگانہ بہ

آبگون تیغے، کہ داری در کمر | نیم شب، از تاب او، گردد سحر

نیک میدانم، کہ "تیغ نادر" است | من چگویم باطن او ظاہر است

آہ، اس دن کی یاد بھی دل سے نہیں جاتی، جب اس گوہر یکتا کا مرقد، اور خاکِ اقبال کا تعویذ اور کتبہ بھی ہمارے ہی زیر اہتمام بننا شروع ہوا۔ اگر خیر مقدم کے خطابوں، عزیز مہمانوں کے جلسوں، اور علم و ادب کی محفلوں کی مسرتیں ہمیں حاصل ہوئیں تو محافل عزاداری کا انعقاد، اور "وفاتِ اقبال" کے مراثی کا درد بھی کچھ ہمارے ہی ادارے کو اٹھانا پڑا۔

حکومتِ بیدار نے ممدوح کی وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کیا، اور اس دوستِ یگانہ کی ابدی آرامگاہ کا تعویذ یعنی "مرقدِ اقبال" کے بننے کا حکم صادر فرمایا۔ کوہسار افغان نے بھی اپنا خونِ دل، رنگین اور حسین پتھروں کی شکل میں اس حُدی خوانِ ملت کے خاموش مسکن پر نچھاور کر دیا، اور ادبائے افغان کے آنسو، فارسی اور پشتو کے خطابوں اور "مراثئے اقبال" کی صورت میں، صفحۂ کاغذ پر برس گئے، جن میں سے ملک الشعرا کا مرثیہ جو فارسی ادب میں اپنی آپ نظیر ہے، یادگار اً پیش کرتا ہوں۔

اقبال، رخت بست و ز ہندوستان برفت | کان فیلسوفِ عالمِ شرق، از میان برفت

با یدبنا رسائے بخت، و ز غم گریست | کاقبال را گذاشت، کہ زود از جہان برفت

افتاد گوہرے، ز کفِ دہر، رُوئے خاک | بیچارہ دہر بین! کہ بر دین زیان برفت

از دستِ خویش، دامنِ اقبال دادہ ای؟ | شرمے کُن اے زمانہ! ز دستت چسان برفت

دل ما توانِ شرح نباشد، ازو مپرس! | کز رفتنش، چہ بر سرِ آن ناتوان برفت

ہر چند، خود جریدہ، ازین کوئے در گذشت | در ماتم، از قفائے وے، اشکِ روان برفت

نام و نشانِ فلسفہ، محو ار شود، بجاست | کان فیلسوفِ صاحبِ نام و نشان برفت

دیگر کجا رسد، بحریفان "پیامِ شرق"! | کان نکتہ سنج صاحبِ شیرین زبان برفت

وا ماندہ تلخ کام، ز حرمانِ خویش، گوش | کان منطقِ مؤثر و سحرِ بیان برفت

دیگر رموزِ حکمت و دین، از کہ بشنویم؟ | آن کاشفِ حقائق را زنہان برفت

ہر نکتہ، دفترے بود، از عالمِ دقاق | آن حرفہا، کہ بر لبِ آن نکتہ دان برفت

درس خوشش، ز مکتبِ "مولائے روم" بود | در عقل و نقل، زآن پئے آن راستان برفت

فکرش بہ آن دو بال، کہ از عقل و نقل داشت | چندان گرفت اوج، کہ بر آسمان برفت

دیداست "بایزید" و "جنید" و "فضیل" را | روحش چو در عروج، بوادئے جان برفت

وانگاہ، مقامِ سیدِ افغان نمود کشف | بارو مُیش، چو حرفِ امامت وا فوان برفت

پیر و جوان، چو طفلِ یتیم اند، اشک ریز | کان زندہ دل ادیب، بلیغ جوان برفت

یادش مقیمِ خلوتِ دلہا، و نامِ او | از بسکہ زندہ است، کران تا کران برفت

آسودہ از گداز غمِ دہر، خوش بخاک | گوئی، چو اشکِ غمزدہ، از دیدگان برفت

آثار خود، بدہر، چو "جاوید" ماندہ است | ہرگز نمُردہ، بلکہ ازین خاکدان برفت

تاریخ فوت، خامۂ "الف" برکشیدہ گفت

اقبالِ ہند، ماہِ صفر، از جہان برفت

(۱۳۵۷ ہجری قمری)

---

۱ الولد سرٌ لابیہ

۲ علامہ ممدوح کی مکمل شرح حال میں یہ خطابے اور مرثیے مع تراجم شائع کر دئے جائیں گے۔

۳ قاری عبداللہ خان ملک الشعرا انجمن ادبی کابل (افغان اکیڈمی) میں بحیثیت مبصر زبان کام کرتے تھے اور اب ریاست مطبوعات میں شرعی مشیر ہیں۔ آپکی قدر و منزلت ہر ایک کے دل میں ہے۔ اور خورد سے بزرگ تک آپکا احترام کرتے ہیں۔

۴ اس کی سیر ہفت افلاک کی طرف اشارہ ہے۔

۵ سیر ہفت افلاک میں اس کے پرواز تخیل نے جن اشخاص بزرگ کی پاک روحوں سے ملاقات کی انہیں سے بعض کے نام۔

۶ سید جمال الدین افغانی سے مراد ہے۔

۷ غالباً فلک عطارد میں تخیلِ اقبال نے جمال الدین افغانی کو امامت اور سعید حلیم پاشا ترک کو قیادت میں نماز پڑھتے دیکھا تھا اور مولانا روم (ان کے رہبر) نے اُن کے نام بتائے، اس فضائے پاک میں آذان کی لذت کو بھی علامہ نے ایک خاص پُر اثر طریق سے ادا کیا ہے۔ یہ شعر اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۸ "جاوید" علامہ اقبال کے بیٹے کا، اور "جاوید نامہ" اس کی ایک کتاب کا نام ہے،

۹ تعمیۂ خارجہ۔ ۱۰ مصرع آخر کے اعداد حروف بحساب جمل ایک ہزار تین سو اٹھاون بنتے ہیں اگر عدد "الف" کے تعمیۂ خارجہ کو جس سے "ایک" مراد ہے، خارج کر دیا جائے تو ایک ہزار تین سو ستاون (۱۳۵۷) رہ جائے گا، جو تاریخ وفات اقبال ہے۔

رباعی

(از خان صاحب جناب حکیم محمود علی خان صاحب ماہر اکبر آبادی)

کہتے ہیں کہ طوطیٔ زمین ہیں خسرو
رُوحِ اوستانِ چمن ہیں خسرو
میرا یہ عقیدہ ہے بجائے ماہر
شاہنشہِ اقلیمِ سخن ہیں خسرو

ٹیگور کا سیاسی نصب العین

قومیت اور بین الاقوامیت کے مسئلہ پر ایک نظر

(از ڈاکٹر ایم، حفیظ سید، ایم، اے، ال، ٹی۔ پی، ایچ، ڈی، ڈی، لٹ)

ٹیگور قدیم ہندوستانی تہذیب کا سچا ترجمان تھا۔ اُسے پرانی تہذیب و تمدن کی ایک حیرت انگیز بصیرت حاصل تھی۔ وہ پنی روحانی بیداری کے لئے بھی ہندوستان کے قدیم طریقہ روحانیت کا منت کش تھا۔ روحانی زندگی میں مدلل اور گہرے یقین کے ساتھ ساتھ اُسے ہندوستان کی تمدنی روایات اور اُن کی روحانی قدروقیمت کا صحیح اندازہ تھا اُسے انسان کی عظیم الشان امکانی قوتوں، اس کے لامحدود عروج اور شاندار مستقبل کا پورا یقین تھا۔ وہ بنی نوع انسان کی فضیلت اور عظمت کو دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ وقیع سمجھتا تھا۔ ہندوستانی آدرش کا اٹل معتقد ہونیکی حیثیت سے وہ انسانی فطرت سے اچھی طرح آشنا تھا۔ اس انسان کی فطرت سے جو صرف مادہ سے نہیں تعمیر کیا گیا ہے بلکہ جسکے اندر روح بھی ہے نسل انسانی کا مشترکہ ورثہ زیادہ تر روحانی ہے۔ انسان کے ارضی کمالات فنا ہوجانے والے ہیں۔ اس کا اصلی وجود روحانی ہے اور اس لئے غیر فانی۔ زندگی کا یہ پہلو زوال اور موت کے بندھنوں سے آزاد ہے۔ یہ شے ابدیت کی حامل ہے۔ دور جدید میں زندگی کے اس پہلو سے عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے۔ ہندوستانیوں کا فرض تھا کہ وہ اس مسئلہ پر اپنی خاص توجہ صرف کرتے لیکن اُنھوں نے مغربیت کی لہروں پر اپنے کو آزاد چھوڑ دیا ہے اور اس مغربی آدرش کی پوجا کر رہے ہیں جس کا اصلی رجحان مادیت کی طرف ہے۔ ہندوستانیوں کی آنکھیں مغربی سائنس کے کارناموں سے چکاچوند ہوگئیں ہیں اور انھوں نے زندگی کے ایک بلند تر مقصد کو فراموش کردیا ہے۔ ہم نے مغربی خیالات کی تقلید میں عارضی طور پر خود اپنے نصب العین اور روایات کو بھلا دیا ہے۔ ٹیگور کہتا ہے کہ انسان کو اپنی انفرادیت نہیں کھونی چاہیے۔ جو بات ایک فرد کے لئے مفید ہے وہی ایک پوری قوم کے حق میں بھی مفید ثابت ہوتی ہے۔ فرد یا قوم کو اپنے قدیم روایات بالکل نظر انداز نہیں کردینے چاہئیں۔

ٹیگور اپنی تصنیف "نیشلزم" میں ایک جگہ کہتا ہے "ہم ایسی چیز کے متلاشی ہیں جو تمام نسلوں میں مشترکہ ہو، اور جو ان کے حقیقی اتحاد اور یگانگت کو ثابت کردے کسی قوم کے لئے محض سیاسی یا تجارتی اتحاد کافی اور تشفی بخش نہیں ہوسکتا۔ اہل دماغ اس روحانی اتحاد کو ڈھونڈ نکالیں گے اور اس کو عملی طور پر کامیاب بنانے کی کوشش کریں گے"۔ پھر کہتا ہے:۔

"ہندوستان کو کبھی قومیت کا صحیح احساس نہیں رہا ہے بچپن ہی سے مجھے تعلیم دی گئی تھی کہ قوم بنی نوع انسان اور خدا سے بالاتر ہے۔ لیکن اب یقیناً میں اس قسم کے نظریہ سے بلند ہوں میرا ایمان ہے کہ میرے ہموطن اس نظریہ کے خلاف جنگ کر کے ہی (جو انھیں وطن کو انسانیت کے نصب العین سے بلند ہونا سکھاتی ہے) اپنے ملک کو صحیح معنوں میں آزاد کرسکتے ہیں"۔ جدید

یورپ کے چند صف اوّل کے مفکرین بھی قومیت کے نظریہ کی تائید نہیں کرتے۔ یہ مفکرین اس نظریہ کو باہمی جنگ، بغض و حسد، رقابت، نزع و فساد، نفرت اور جنگ کا اصلی سبب مانتے ہیں، ہندوستانی تہذیب کا نصب العین پھوٹ ڈالنا نہیں بلکہ اتحاد پیدا کرنا ہے۔ ٹیگور اس دور کا واحد مفکر نہیں جس نے بین الاقوامیت کے مقابلہ میں قومیت کے نظریہ کو نظر انداز کردیا ہے بہت سے سیاسی مفکرین نے (مثلاً سر نارمن انجل۔ برٹرنڈ رسل۔ شیلر گارسٹن۔ جے، ایچ، سی۔ اور ہرنارڈ جوزف) قومیت کے مروجہ نظریہ کو پس پشت ڈال کر بین الاقوامی اتحاد اور باہمی اشتراک و تعاون کی حمایت کی ہے۔

بیشمار سیاسی نقادوں نے اسے تسلیم کیا ہے کہ قومیت کا نظریہ عیوب سے خالی نہیں ہے لیکی اور لارڈ ایکٹن جو آزاد نظریوں اور روایات کی آغوش میں پلے تھے اور انیسویں صدی کے سیاسی مفکروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ایک وسیع شہنشاہی سلطنت کے مفید اثرات کی بدیع ہمنوائی کرتے ہیں اور ساتھ ہی اُس تنگ نظری اور رغیر رواداری سے خائف ہیں جو الگ الگ قومی سلطنتوں میں تقسیم شدہ دنیاوی نظام سے پیدا ہوتی ہیں۔

ضرورت ہے کہ قومیت اور بین الاقوامیت کو ہم آہنگ اور متحد کر کے اوّل الذکر کو ایک معتدل حالت پر لانے کی کوشش کی جائے۔

وطن کی محبت، قومی زبان، ملکی روایات اور قومی نصب العین کی حمایت قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قومیت کے عیوب کا اعتراف کریں اور ساتھ ہی ان کے دُور کرنے کی بھی کوشش کریں، قومیت بین الاقوامیت سے ہم آہنگ کردی جائے اور دُنیا کی دوسری اقوام کا احترام کرنے کے جذبہ کو فروغ دیا جائے۔ پروفیسر جان وائس نے ایک مؤثر پیرایہ میں کہا ہے۔ قومی وفاداری کے جذبہ کو اعلیٰ و ارفع کر کے ایک ایسی حُب الوطنی میں تبدیل کردیا جائے جس میں وطن کی محبت اور بین الاقوامی احترام دونوں ہم آہنگ ہوجائیں"

"میرے پاس وطن کی محبت کا کوئی تصوّر نہیں ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ (یعنی وطن کی محبت) زیادہ سے زیادہ ایک بہادرانہ جذبہ ہے جس کے بغیر بھی مجھے پورے طور پر سکون اور اطمینان حاصل ہے"

شیلر کہتا ہے "میں دنیا کا باشندہ ہوں اور اسی حیثیت سے لکھتا ہوں --- وہ دُنیا جو کسی حکمراں کی غلام نہیں۔ میں نے اپنے وطن کو اس وسیع و عریض دنیا کے عوض کھو دیا ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی قوم اس وسیع و عریض دنیا کا محض ایک جزوی حصہ ہے۔

حقیقی بین الاقوامیت قوموں کے درمیان اشتراک و تعاون کو فروغ دیتی ہے: نہ کہ ان کی ابھرنے کی خواہش کو دباتی ہے، اب یہ ظاہر ہوگیا کہ قومیت کے عیوب کو مٹانے کا طریقہ اس کے وجود کو ختم کردینا نہیں ہے بلکہ قوموں کے درمیان رفتہ رفتہ دوستانہ تعلقات کو استوار کرنا اور ان کو باہمی اشتراک و تعاون کی بنیادوں پر منظم و متحد کرنا ہے۔

ٹیگور دُنیا کے ہر مسئلہ میں دلچسپی لیتا تھا، اسے تمام انسانی امور سے گہری ہمدردی تھی، وہ سب کی فلاح و بہبود میں یکساں طور پر دلچسپی لیتا اور ہر تمدن کے بہترین اور پائدار عناصر کی قدر کرتا تھا۔ وہ ایک فراخ دل اور وسیع النظر انسان تھا۔ بنی نوع انسان کی وحدت اور اس کے مشترکہ نصب العین میں اعتقاد رکھنے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی اتحاد، ہم آہنگی اور اشتراک عمل کا زبردست حامی تھا۔ وہ جنگ کا سخت مخالف تھا، اس نے بار بار جنگ آمیز قوموں سے آلاتِ حرب کے استعمال کو خیر باد کہکر باہمی مفاہمت کے ذریعہ طے کرلینے کی خواہش کی۔ ایسی مفاہمت اُسے پسند تھی جو انصاف، مساوات اور رائے عامہ کے بطن سے پیدا ہوئی ہو۔ اِس کے ساتھ اُسے ہندوستانی قوم اور ہندوستان سے محبت تھی اور وہ اس کی ترقی کے لئے کوشاں تھا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ قومیت اور بین الاقوامیت کے یہ متضاد نظریئے کیونکر اس کی تعلیمات میں ہم آہنگ ہوتے ہیں اور مذہب انسانیت Humanitarianism - اور قومیت کے پیرو ہونے کی حیثیت سے اس کی کامیابی کا کیا راز ہے۔ پورے قدیم ہندوستانی تصور کا مرکزی عنوان "وحدتِ کائنات" ہے۔ ایک ہی زندگی ہے جو ہر ذرہ میں گونج رہی ہے اور ایک ہی غیبی شعور ہے جو تمام چیزوں میں منکشف ہے انسان کی اندرونی شخصیت تمام انسانوں کی شخصیت ہے، اس میں کسی قسم کے اضافہ یا تخفیف کا امکان نہیں، یہ ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ اسی "مشترکہ حیات" کے اصول کے تحت جو سب کا حصہ ہے ہندوستان کی مقدس کتابوں نے تمام ذی روح ہستیوں کو مخاطب کیا ہے اور ہمیں اِن کی بہبودی کے لئے اپنے کو وقف کردینے کی ہدایت کی ہے۔ اِس شاندار نصب العین میں کامل ایمان رکھنے کے بعد شاید ہی کوئی مفکر اپنے سیاسی نظریوں میں اس سے انحراف کرسکتا ہے۔ ٹیگور نے ہندوستانی روایات کو پورے پورے طور پر اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔ وہ ان تمام لوگوں کا ہمدرد اور دوست تھا جو اپنے سامنے ایک مشترکہ مستقبل رکھتے ہیں، یہ اُس کے وسیع اور ہمہ گیر نظریہ کا بیّن ثبوت ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ایک انسان کی اللہ واسطے اور بے لوث خدمت گویا پورے بنی نوع انسان کی خدمت ہے، بیک وقت پوری نسل انسانی کے فلاح و بہبود کے لئے کوشش کرنا ایک انسان یا ایک جماعت کی بس کی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص یا ایک جماعت تمام پوری کائنات انسانیت کی ہمدرد اور بہی خواہ بنجائے لیکن صرف ایک محدود طریقہ سے اور ایک مخصوص دائرہ میں رہ کر اپنے ہمجنسوں کی خدمت کرے۔

ہر شخص اپنے گذشتہ زندگی کے طرز عمل اور تعلقات کے مطابق کسی مخصوص خاندان، فرقہ یا قوم میں پیدا ہوتا ہے، ہر انسان کا فرض ہے کہ اپنے گذشتہ فرائض اور ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر مذہب و ملت کے اصول پر کاربند رہے۔

ٹیگور کچھ مندرجہ بالا اسباب کی بنا پر اور وطن کی خدمت کرتا تھا اور کچھ اس سبب سے کہ اس کا ایمان تھا کہ ہندوستان کی تہذیب میں بنی نوع انسان کے لئے ایک پیغام ہے جسے تفیگراہ انسانوں تک پہنچا دینا ہر ہندوستانی کا فرض ہے۔ اگر ہندوستان اسی طرح غلام اور نادار بنا رہا تو اس کا پیغام ہزار قیمتی ہو اِس توجہ سے نہیں سُنا جائیگا جس کا کہ وہ مستحق ہے۔

ٹیگور بجا طور پر ہندوستان سے محبت اور اس کی خدمت کو پوری کائنات انسانیت کی خدمت سمجھتا تھا۔

اِس کی نگارشات تنگ نظر قومیت سے عاری اور ایک وسیع ترا سپرٹ کی حامل ہیں۔ اس کی تحریروں میں جو پیغام مضمر ہے وہ ہندوستانیوں کے لئے بلکہ ساری دنیا کے استفادہ کے لئے ہے۔ ڈاکٹر سنڈر لینڈ نے خوب کہا ہے کہ دنیا کے کسی ملک نے مذہب اور زندگی کے ہر معاملہ پر اتنے زیادہ عمیق مفکر نہیں پیدا کئے ہیں جتنے قدیم ہندوستان نے، جدید ہندوستان میں ٹیگور سے زیادہ دانا، رحمدل۔ وسیع النظر اور عظیم الشان مفکر کوئی نہیں"۔

ٹیگور میں ایک ایسی بصیرت تھی جو کثرت میں وحدت کو پالیتی تھی، وہ فرد اور سماج، فرقہ اور قوم، دنیا اور سلطنت کی تقسیم کو قطعی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ دراصل اس نظریہ میں باطنی مشاہدہ ہے۔ رابندرناتھ کا مذہبی پیغام سادہ اور بدیہی ہے۔ "مختلف مذاہب کو پس پشت ڈال دو اور ان کے متحدہ اصول پر کاربند ہو"۔ مسرت ان کا حق ہے جو روح کی اِس وحدت اور کاملیت کو پالیتے ہیں" وہ کثرت میں بنیادی اتحاد دیکھتا ہے اس لئے اس کا مذہبی پیغام تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے مذاہب جو ہندوستان کی سرزمین پر یکجا جمع ہوگئے ہیں اپنے تمام درمیانی اختلافات کو مٹا کر آپس میں مصالحت کرلیں گے "ہندوستان کی سرزمین پر ہندو، بودھ مذہب والے، مسلمان، عیسائی آپس میں خانہ جنگی کرنے کی بجائے ایک امتزاج و اتحاد تلاش کرنے کی کوشش کرینگے اور وہ امتزاج مذہب سے کوئی مختلف چیز نہیں ہوگی بلکہ وہ مخصوص طور پر اس کے موافق ہوگی"۔ آج سے پانچہزار سال پہلے کرشن نے صاف اور واضح طور پر کہہ دیا ہے۔

"اے پارتھ Partha مجھ تک لوگ جیسے بھی رسائی حاصل کرینگے میں خوش آمدید کہونگا کیونکہ ہر وہ مسلک جسے لوگ اختیار کریں گے میرا ہی ہوگا"۔

"مجھ سے بلند تر کوئی شے نہیں اے دھنن جے، یہ تمام اشیا مجھ میں منسلک ہیں جس طرح جواہرات دھاگے میں گندھے رہتے ہیں"۔

"میں تمام اشیا کا خالق ہوں۔ تمام اشیا مجھ سے جنم لیتی ہیں، اس حقیقت کو سمجھ کر دانا محو عقیدت ہوکر میری پرستش کرتے ہیں"۔

ٹیگور کسی تنگ عقیدہ صوبائیت یا زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ ہندوستانی تمدن اور اس کے عالمگیر اخوت کے نظریہ پر ہندوستانی قومیت کی تعمیر کرتا ہے۔ اس کی زبردست آرزو تھی کہ اہل ہند ایک ہی ملک کے فرزند ہونے کی حیثیت سے اپنے ملک کی تعمیر کے لئے کوشش کریں، ہندو اور مسلمان دونوں ہندوستان کو اپنے آباؤ اجداد کے

Taj Tahir Foundation

وطن ہونے کی حیثیت سے دیکھیں، کیا ہندوستان کی سرزمین میں، ان کے ولیوں، عالموں، مفکّروں اور فلسفیوں کی خاک یہیں دبی پڑی ہے؟

آج کل کے کچھ تعلیم یافتہ اہلِ وطن ٹیگور کے اس نصب العین سے متفق نہیں کہ ہندوستان کو اپنی قومی شخصیت برقرار رکھنی چاہیئے ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کی نجات مغرب کی کورانہ تقلید میں پنہاں ہے۔ دراصل وہ اپنے گوشت و پوست کی حفاظت میں یہ بھول جاتے ہیں کہ گوشت و پوست کی بجائے روح کو محفوظ رکھنا ہمارے لئے بنیادی طور پر زیادہ مفید ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں اس خیال کا موجود ہونا گویا اس بات کی علامت ہے کہ مرض گہرائیوں تک پہنچ چکا ہے اور حالت قابلِ اعتماد نہیں۔ دراصل قدیم ہندوستان کی اصلی اسپرٹ سے واقفیت حاصل کئے بغیر اور خود اپنے طور پر دیکھنے کی صلاحیت پیدا کئے بغیر اس کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ ہندوستان نے کس تشویشناک حد تک جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے مادی اثرات کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ یہ اہلِ وطن اپنے کو عملی انسان کہتے ہیں اور اس پر نازاں ہیں لیکن اس عملی بننے کی کتنی زبردست قیمت دینی پڑی ہے۔ غالباً انھیں اپنی روح کی بھینٹ چڑھانا پڑی ہے۔

ٹیگور کے الفاظ ہیں "تقلید کی مثال ویسی ہی ہے جیسے ہم اپنے جسم کے ڈھانچہ کو کسی دوسرے آدمی کی کھال سے ڈھانکنے کی کوشش کریں اور اس طرح کھال اور ہڈی کے درمیان ایک دائمی جنگ کی صورت پیدا کر دیں۔" اسے یہ کہتے ہوئے مطلق تامل نہیں کہ "اگر ہندوستان کی سیاسی نجات کی قیمت روح کی شکل میں دینی پڑے گی۔ تو اس سے بہتر ہے کہ ہم اپنی روح کو محفوظ رکھیں اور اس دنیاوی بادشاہت کو ہاتھ سے جانے دیں" رابندرناتھ ہندوستان کی سیاسی غلامی کا کسی خودغرضی کی بنا پر مخالف نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ مغربی مادیت کی اسپرٹ سے خوفزدہ ہے جو آہستہ آہستہ ہندوستان کی روح کو محکوم اور اس کی زندگی اور اسپرٹ کو ضعیف کر رہی ہے۔

ہندوستان کی اصلی اسپرٹ کو برقرار رکھتے ہوئے ہمیں مغرب کی مفید باتوں کو اختیار کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ رابندرناتھ کا مطالبہ قدیم اور جدید یا مشرق و مغرب کی ایک امتزاجی تکمیل ہے۔ تاریخ ہند کی تشریح کرتا ہوا کہتا ہے "خود اپنی چیزوں کو ٹھکرا کر غیر ملکی چیزوں کو اختیار کر لینا مجہول قسم کی گداگری ہے۔" پھر اسی سلسلہ میں کہتا ہے "غیر ملکی اثرات کو قبول کرنا۔ اور اپنی ترقی اور عروج کی رفتار کو روک دینا ذہنی غلامی کا ثبوت ہے" ہندوستان نے اپنی قوتِ زندگی کو برقرار رکھا ہے اور وہ یوں کہ جب کبھی کسی غیر ملکی تہذیب سے اس کے تعلقات قائم ہوئے تو اس نے اپنے تمدن کی بنیادی خصوصیات کو ترک کئے بغیر غیر ملکی تہذیب کے پُرمغز اور مفید اجزا کو اپنے اندر جذب کر لیا۔

مشرق نے مغرب سے بہت کچھ سیکھا ہے، لیکن ہمیں اپنے طرزِ عمل سے مغرب کو یہ دکھا دینا ہے کہ اسے بھی مشرق سے کچھ سیکھنا ہے، وہ مشرق جو ایک بہتر دنیا کی تعمیر میں خود اپنے طور پر حصّہ لے سکتا ہے۔ اپنی تصنیف "نیشنلزم" میں کہتا ہے "مشرق مغرب کا گداگر نہیں ہے۔"

ٹیگور کہتا ہے "یہ میرا ایمان ہے کہ ہندوستان کو سب سے زیادہ ایسی تعمیری چیزوں کی ضرورت ہے جو خود اس کے بطن سے پیدا ہوں۔"

پھر وہ کہتا ہے "اس سلسلہ میں ہمیں ہر قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنا ہے اور تمام جبر و ظلم کے باوجود ان فرائض کو ادا کرتے رہنا ہے جو ہمارا حق ہیں۔ ہمیں اپنی شکست اور مصائب کے ذریعہ قدم بقدم پر اخلاقی فتح حاصل کرنی چاہیئے اور ان کو جو ہمارے اوپر مسلط ہیں یہ دکھا دینا چاہیئے کہ ہمارے اندر اخلاقی طاقت کا زور اور حق کیلئے مصیبت برداشت کرنیکی قوت ہے ——— جب ہمارے پاس دوسروں کے سامنے پیش کرنے کیلئے کوئی چیز نہ ہوگی تو مجبوراً ہمیں بھیک مانگنا پڑے گی۔"

کلامِ سرخوش

(جناب آغا سرخوش قزلباش ایڈیٹر چمنستان دہلی)

درماندہ ہی رہتے ہیں سدا اہلِ وفا کیا؟
ہوتا نہیں دُنیا میں غریبوں کا خدا کیا؟

میں تم کو نہ بھولا تو مری اس میں خطا کیا
تم نے بھی یہ احساس مٹایا تھا۔ مٹا کیا

تم لاکھ بھی بدلا کرو تقدیرِ زمانہ
ہو سکتا ہے بندا کہیں۔ بندے سے خدا کیا؟

فرہاد نے سر رکھ دیا آغوشِ اجل میں
اس کو ہی کہا کرتے ہیں سب کارِ وفا کیا

گو لاکھ میسر بھی ہوں نغماتِ دو عالم
جب تم نہیں پہلو میں تو جینے کا مزا کیا؟

بے حکم جب اس کے کوئی پتّا نہیں ہلتا
ہوتی ہے گناہوں میں بھی تائید خدا کیا؟

شوکت علی خاں فانی

(از جناب آلِ احمد سرور)

اِک عمر پرستارِ شبِ ہجر رہا تھا
اے زلفِ سیاہ ماتمِ فانی میں بکھر جا

یہ پرستارِ شبِ ہجر۔ یہ شہیدِ ستم۔ یہ دل سوگوار۔ یاسیات کا یہ امام ۲۶۔ اگست کو اس دنیا سے رخصت ہوا۔ خود اپنے الفاظ میں

اس آپ کی زمین سے الگ آسمان سے دور

وطن بدایوں تھا مگر قبر حیدرآباد میں بنی۔ سازگار نہ وطن کی ہوا ہوئی نہ پردیس کی۔ یہ احساس ہر وقت رہا۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میّت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

شوکت علی خاں فانی ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے (اُن کے بزرگ شاہ عالم کے زمانہ میں کابل سے آئے تھے۔ دہلی والوں نے بہت نوازا) ان کے پردادا نواب بشارت خاں صوبہ بدایوں کے گورنر تھے۔ مگر رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن کے والد شجاعت علی خاں پولیس کی ملازمت پر مجبور ہو گئے تھے۔ فانی نے آنکھ کھولی تو جو کچھ رہا سہا تھا جا رہا تھا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں اُنہوں نے بی۔ اے اور سنہ ۱۹۰۸ء میں ال۔ ال۔ بی علیگڑھ سے کیا۔ وکالت ایک عمر تک کی مگر کامیابی کبھی نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ فانی نالائق تھے بلکہ وہ اس پیشے سے نفرت کرتے تھے۔ بارہا دیکھا گیا کہ بڑے جبر کے بعد وہ موکلوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ مگر کوئی ملنے والا آ گیا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شعر و شاعری کا شغل شروع کر دیا۔ لکھنؤ۔ بریلی۔ بدایوں اور آگرہ میں عرصہ تک برائے نام وکالت کی مگر دراصل وہاں کے مشاعروں اور ادبی صحبتوں کے روحِ رواں بنے رہے۔ اُنکی ابتدائی شاعری میں لکھنؤ کا اثر اسوجہ سے نمایاں ہے کہ جب اُنہیں شعر کہنا آیا تو وہ لکھنؤ میں تھے۔ اس ماحول سے کیسے متاثر نہ ہوتے۔ میں نے اُنہیں اپنی زمانہ طالب علمی میں آگرہ میں اکثر دیکھا۔ وہ اس زمانہ میں عام مشاعروں میں کم جاتے تھے۔ مگر طالب علموں کی دعوت رد نہ کرتے تھے۔ دیوان فانی سنہ ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا تھا۔ باقیات سنہ ۱۹۲۶ء میں نکلی۔ باقیات کی اشاعت کے بعد سے فانی دورِ حاضر کے ممتاز شاعروں میں سمجھے جاتے تھے۔ فانیؔ کا کلام لوگ سمجھیں یا نہ سمجھیں اُن کے کمال کا اعتراف مذاقِ سلیم کی پہچان تصور کیا جاتا تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کے بیچ میں جو علاقہ ہے اُس میں میراسنیں اکثر گھروں میں تقریبوں کے موقعہ پر گیت گاتی ہیں۔ اُن گیتوں کے ساتھ فانیؔ کی غزل "مآلِ سوزِ غمِ ہائے نہانی دیکھتے جاؤ" میں نے اکثر سنی ہے۔ جس مشاعرے میں فانی ہوتے لوگ ان کا کلام سننے کے بڑے مشتاق نظر آتے۔ فانی کا وجود ہی بڑے بڑے مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت تھا۔ ان کی آواز بہت اونچی نہ تھی اس لئے وہ بہت دور تک سنائی نہ دیتی تھی۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ فانی نے کوئی شعر پڑھا۔ جو آگے بیٹھے تھے اُنہوں نے تو سُن لیا مگر پیچھے کے لوگ نہ سن سکے۔ اس پر ایک ہنگامہ شروع ہوا۔ مگر دوسرا شعر پڑھتے ہی مکمل خاموشی طاری ہو جاتی۔ یہ اپنی پُرسوز۔ دھیمی۔ مگر بلا کی پُرکیف آواز میں جھوم جھوم کر پڑھتے تو تھوڑی دیر کے لئے یہ معلوم ہوتا کہ کائنات پر ایک درد سا طاری ہو گیا ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر ان کی غزل کا ایک شعر مجھے نہیں بھولتا۔ ؎

وہاں سجدے سے ابتک قدسیوں کے سر نہیں اُٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہِ محبت میں قدم میرا

فانیؔ کے گھر پر شاعروں اور شعر سننے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ صاحبِ ذوق لوگوں کے سامنے شعر سننے یا سُنانے میں انہیں بہت کم تکلف ہوتا تھا۔ میرؔ کی طرح دوسروں کے کمال کا اعتراف گناہ نہ سمجھتے تھے اپنے معاصرین میں بعض کے بڑے مداح تھے۔ ایک دفعہ اپنی مشہور غزل "ہستی کی کیا ہستی ہے" پڑھ رہے تھے۔ جب اس شعر پر پہنچے تو بہت تعریف ہوئی۔

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کُھلتی ہے نہ برستی ہے

کہنے لگے کہ میں نے کیا یاس (یگانہ) نے یہ قافیہ نظم کیا ہے۔ ؎

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال پر تو ظالم کی سادگی برستی ہے

جگرؔ کے بعض اشعار کے بڑے مداح تھے۔ خصوصاً اس شعر کے جو دراصل ان کے رنگ میں ہے۔ ؎

یوں بسر کی زندگی ہم نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخلِ آدابِ زنداں ہو گیا

آگرہ میں فانیؔ نے کافی عرصہ گذارا۔ مگر وہ مالی مشکلوں میں برابر مبتلا رہے سنہ ۱۹۳۲ء میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد کی دعوت پر حیدرآباد گئے اور وہاں سنہ ۱۹۳۹ء تک صدر مدرس رہے۔ حیدرآباد میں آخر میں فانیؔ کی زندگی جو یوں بھی کم سوگوار نہ گذری تھی اور بھی تلخ ہو گئی۔ لڑکوں نے کچھ نہ کیا۔ جوان لڑکی سنہ ۱۹۳۲ء میں مر گئی تھی۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں بیوی بھی رخصت ہوئیں۔ اس عالم میں ان پر جو گذری اس کا کچھ اندازہ اس مادہ تاریخ سے ہو سکتا ہے جو اُنہوں نے اپنی موت کا نکالا تھا

غالب تو صرف یہ کہکر رہ گئے۔

زندگی اپنی جب اسں شکل سے گذری غالبؔ   ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

لیکن فانی اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ خدا انداشت اس مایوسی اور تلخی کی آئینہ داری کرتا ہے جو اس زمانہ میں اُن کی طبیعت میں آگئی تھی۔ بھوپال کے مشاعرے میں اُن کی شرکت کی وجہ سے بڑی رونق ہوگئی تھی۔ شمالی ہند والوں نے ان کی زبانی آخری بار اُنکی غزل آل انڈیا ریڈیو دہلی کی مہربانی سے سُنی۔ اس کا مطلع یہ تھا۔

جب پرسشِ حال وہ فرماتے ہیں جانئے کیا ہو جاتا ہے
کچھ یوں بھی زبان نہیں کھلتی کچھ درد سوا ہو جاتا ہے

اُنکی ایک اور غزل اسی مشاعرے میں جگرؔ نے پڑھی تھی اس کا مقطع یہ تھا۔

فانیؔ دکن میں آکے یہ عقدہ کھُلا کہ ہم   ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان دور

فانیؔ بڑے خلیق اور متواضع آدمی تھے۔ مگر ان میں ایک سچے شاعر کی خودداری اور غیرت پوری طرح موجود تھی۔ اُنھوں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ اُنہوں نے معاصرین کی برائی کرکے بھی اپنا دل ٹھنڈا نہیں کیا۔ اُن کی شہرت تو بہت ہوئی مگر اُن کی قدر اچھی طرح نہیں ہوئی۔ خود اُنکے الفاظ میں اُن کی زندگی ایک مقدس قسم کا تماشا بنی رہی جسے دور سے دیکھ دیکھکر ہی لوگ اثر لیتے رہے۔ اُن کا دم نکلتے دیکھا مگر سمجھے کہ تمام عمر اُن پر نزع کی کیفیت طاری رہنا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ ایک یونیورسٹی میں ایک معمولی عہدے کے امیدوار تھے تو یہ کہکر انہیں ٹال دیا گیا کہ آپ نے کچھ ریسرچ بھی کی ہے یا نہیں۔ ہرن پر گھاس لادنے کی اس سے اچھی مثال شاید ہی ہو سکے۔

فانیؔ کا رنگ قدیم تغلنہ ساری عمر غزل کہتے رہے۔ وہ غزل ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ غزل اور نظم محض میں فرق کرتے تھے۔ انکا ایمان یہ تھا کہ شعر کو کسی خاص غیر شاعرانہ مقصد کے حصول کے لئے آلۂ کار نہیں بنایا جاسکتا۔ خواہ وہ مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ نظریہ وہی زندگی برائے ادب والا ہے اور اس دور میں اس کی نارسائی واضح ہوچکی ہے۔ فانیؔ کا یہ بھی خیال تھا کہ جس دنیا میں شاعر کا ظہور رہتا ہے وہ دنیا اس کی اپنی دنیا سے بہت پیچھے ہوا کرتی ہے، دوسرے الفاظ میں وہ شاعر کو اس دنیا اور اس کے مسائل سے بلند سمجھتے تھے۔ اُنہیں اس کا اندازہ نہ ہوسکا کہ یہ بلندی فرضی ہے ورنہ شاعر در اصل اپنے ماحول۔ اجتماعی اثرات۔ ذہنی اُلجھنوں اور مادی مشکلات سے اثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اقبالؔ کے زیادہ قایل نہیں تھے۔ شاید اس لئے کہ انکے اپنے ذہن میں شاعری کا ایک خاص تصور اس قدر روشن تھا کہ وہ دوسرے کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

مگر بڑی بات یہ ہے کہ گو فانیؔ کی شاعری ہمارے ادب میں ایک بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ فانیؔ نے غزل کی صورت یا موضوع میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اُنہوں نے غزل کی زبان بھی نہیں بدلی۔ بظاہر اُن کے یہاں وہی آشیاں اور قفس۔ زندان اور صحرا۔ جنازہ اور کفن۔ شمع اور پروانہ ملتے ہیں جو اُن سے پہلے شاعر نظم کرتے آئے ہیں۔ مگر شاید کم لوگوں نے یہ علامتیں اسقدر صداقت سے استعمال کی ہوں گی جتنی فانیؔ نے۔ فانیؔ کے یہاں یہ چیزیں رسمی طور پر نہیں ہیں۔ ان کی زندگی ہی ان سے عبارت ہے میرؔ کا ایک مشہور شعر ہے۔

اک موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی   شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

فانیؔ کے یہاں ذرا اسی چیز کو دیکھئے۔

یہ چمن سے رخصت فانیؔ قریب ہو شاید   کچھ اب کی بوئے کفن دامن بہار میں ہے

در اصل اُردو شاعری میں میرؔ کے بعد اگر کوئی بے پایاں درد۔ لامحدود یاس اور بیکران غم کا مالک ہے تو وہ فانیؔ ہیں۔ پھر بھی ان کی شاعری بعض لکھنوی شعرا کی طرح روتی بسورتی نہیں ہے۔ ان کے یہاں غم کا ایک طوفان ملتا ہے۔ جو زندگی اور موت دونوں کو گوارا بنا دیتا ہے۔ فانی موت سے گریزاں نہیں وہ موت کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہمارے کتنے ہی شاعر اتنی جرأت نہیں رکھتے کہ موت سے آنکھیں چار کرسکیں۔ وہ غم سے بھاگ کر یا تو رنگینئ جوشش تغزل میں پناہ لیتے ہیں۔ یا مے و شاہد کے آغوش میں۔ فانیؔ کے یہاں یہ پناہ گزینی کا جذبہ نہ ملے گا۔ وہ تلخئ حیات کو زہر سمجھکر چھوڑ نہیں دیتے۔ ایک حقیقت نگار شاعر کی طرح وہ اس تلخی سے واقف ہیں۔ علانیہ کہتے ہیں۔ ؎ بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا۔

فانیؔ کے یہاں شروع میں لکھنو کے اثر سے لہو میں بھری ہوئی چھری۔ دیدار میت لاش کی بے زبانی بہت زیادہ تھی۔ بعد میں غالبؔ کے اثر سے انہیں فلسفۂ غم سے زیادہ دلچسپی ہوگئی۔ غالبؔ اُردو کے پہلے صاحب فکر شاعر ہیں۔ اُنہوں نے جوانی دیوانی کی داستان بیان کرنے یا خشک نصیحت کرنے پر اکتفا نہیں کی۔ حیات وکائنات کے مسائل کو شاعرانہ زبان میں بیان کیا۔ ان کا کلام ایک غیر معمولی ذہین آدمی کا کلام ہے۔ ان کی شخصیت بڑی دلکش اور دلاویز ہے۔ اُنکی زبان اُنکی اپنی ہے، مانگے کی نہیں۔ اُن کی ترکیبیں خیال آفریں ہیں۔ اقبالؔ اور فانیؔ دونوں ان سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اقبالؔ نے غالبؔ کی صناعی کو اختیار کرلیا۔ فانی نے غالبؔ کے اُسلوب فکر کو۔ غالبؔ کا اثر فانیؔ کے یہاں ساری عمر ملتا ہے۔ مگر جنہوں نے فانیؔ کو فانی بنایا وہ غالب نہیں میرؔ ہیں۔ غالبؔ کے یہاں جو اثر بیدل کا ہے وہ فانی کے یہاں غالبؔ کا ہے۔ فانیؔ کے فلسفیانہ اشعار اتنے اہم نہیں جتنے اُن کے وہ اشعار جو میرؔ کے رنگ میں ہیں۔ فلسفیانہ اشعار میں بعض وقت فانی الفاظ میں اُلجھ جاتے ہیں۔ میرؔ کے رنگ میں وہ بعض وقت میر سے بھی بلند ہو جاتے ہیں۔ میرؔ اور غالبؔ ان دونوں کے رنگوں سے فانیؔ کا رنگ بنا ہے اگرچہ اس میں حسرتؔ کی جھلک بھی ہے۔ ذرا دیکھئے۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا   بات پہنچی تری جوانی تک
اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی   دیکھوں تیرے ہونٹوں پر ہنسی آئی ہوئی سی
غلط انداز نگاہوں کو سنبھال   میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ
کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں   ابتک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

فانیؔ کے اشعار میں بلا کی تاثیر ہے۔ یہ تاثیر زبان پر حیرت انگیز قدرت کی وجہ سے بھی ہے۔ عرفانیات ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں انکے صاف اور سادہ شعر بہت ملتے ہیں۔ ان میں صرف خیال ہی سادہ نہیں۔ کہیں کہیں بڑی بلاغت

بھی آگئی ہے۔ فلسفیانہ اظہار آخر تک ہے۔ مگر فلسفیانہ اشکال کم ہوگیا ہے۔ میرؔ کی چھوٹی بحریں اور میرؔ کی طویل بحریں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ ان کی زندگی اور شاعری میں وہ مکمل ہم آہنگی ہے کہ دوسری جگہ کم نظر آئے گی۔ وہ ہمارے صاحب فکر شاعروں میں سے ہیں۔ اُردو کے اچھے اچھے اشعار کا جب کوئی مجموعہ تیار کیا جائیگا تو فانیؔ کے بہت سے اشعار ممتاز جگہ پر ہونگے۔ شاید ان میں سے چند یہ ہوں۔

اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا   زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا
مرکے ٹوٹا ہی کہیں سلسلۂ قید حیات   مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے
پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا   جب ذکر بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی
کیا عمر میں اب آہ بھی بخشی نہیں جاتی   اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے
میں نے فانیؔ ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات   جب مزاج حسن خود برہم نظر آیا مجھے
محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا   آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے
اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ   اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

اللہ رے سکون قلب اس کا دل جس نے لاکھوں توڑ ڈالے
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

آخر میں فانیؔ کی دو رباعیاں بھی سُن لیجے۔ چوتھے مصرعے کو پڑھتے وقت خیال ہوتا ہے کہ دل پر واقعی چھری چل رہی ہے۔

بجھتی ہی نہیں شمع جلے جاتی ہے   کٹتی ہی نہیں رات ڈھلے جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شد فانیؔ   سینے میں چھری ہے کہ چلے جاتی ہے

ناکام ازل کی کامرانی معلوم   قسمت میں نہ ہو تو شادمانی معلوم
جینے سے مراد ہے نہ مرنا شاید   ورنہ فانیؔ کی زندگانی معلوم

اُن کی یہ زندگانی تو ختم ہوئی مگر ان کے اشعار کی زندگی عرصہ تک قائم رہیگی۔

(منشور از نشرگاہ دہلی)

زندگی

(از جناب قیسی رام پوری)

اجتماعیت سے قائم ہے نظام زندگی   سیکھ لو ذرات سے طرز قیام زندگی
دائے ناکامی کہ منزل تک پہنچنے سے قبل   ہوگیا راہ طلب میں سست گام زندگی
ہر ہزیمت دیتی ہے مجھکو پیام جہد نو   رشک کے قابل ہے میرا اہتمام زندگی
آپ کیوں اسکی تباہی پر بہائیں اشک غم   ہو جسے مرغوب خود ہی انہدام زندگی
آرزوؤں کی فراوانی سے قائم ہے حیات   اُنکے ہی دم سے ہے باقی احتشام زندگی
دردہ کی ٹیسیں، الم کی چٹکیاں غم کی خلش   ہو رہا ہے آج پورا انتقام زندگی
ہوں اگر دست قضا سے منتشر اجزائے زیست   کوئی کرسکتا نہیں پھر انصرام زندگی

بالوں کو خوبصورت بنانے کیلئے

سواستک کیسٹر آئیل
بالوں کو گرنے سے روکتا ہے
دماغ کو تراوٹ پہنچاتا ہے۔
بلالحاظ عمر یہ تیل ملائم اور گنجان بال پیدا کرنے کے لئے مشہور ہے
آج سے ہی استعمال کرنا شروع کردیں
Swastik
PERFUMED Castor oil
SWASTIK OIL MILLS LTD BOMBAY 15
ڈسٹری بیوٹرس
دھرمارتھ گاڈودیا سودیشی سٹور کوچہ نٹواں دہلی
فون نمبر ۵۲۳۲

فیکٹری

(از جناب نسیم سیفی۔ بی۔ اے)

شہر سے کچھ فاصلہ پر ایک صحرائے غبار
زندگی کی راحتوں کا یاس آلودہ مزار

ماتمی سی تیرہ و تاریک افسردہ فضا
دودِ آہِ بیکسیٔ افلاس تخئیلِ ضیا

لمحے لمحے پر فنا اپنا کفن ڈھانپے ہوئے
رہروانِ منزلِ ہستی ہیں یاں ہانپے ہوئے

کسقدر مدھم ہے اس ماحول میں نبضِ حیات
کیا ہوا کیوں مٹ نہیں جاتا نظامِ کائنات

رونقِ شامِ شفق پرور کا دامن تار تار
کانپ اُٹھتا ہے سحر کا شبنمی حسن و نکھار

چاند کی میٹھی خنک کرنیں زمیں سے دور دور
جستجوئے مسکنِ نو کی پریشانی میں چور

بھاپ کی بیتاب سانسوں میں امنگوں کا لہو
بادلوں کے دوش پر لرزاں نگاہِ آرزو

نغمۂ فطرت کی ہر اک لے ہے تھرائی ہوئی
یاس نے اک چھاؤنی سی ہے یہاں چھائی ہوئی

صبحدم اک تھرتھراتی سی صدائے بے سکوں
نیند کی خاموشیوں کا توڑ دیتی ہے فسوں

شہر میں لیتی ہے ویرانوں سے آکر یہ پناہ
ہائے قدرت کا ستم قدرت کا اک رنگیں گناہ

مادرِ غربت کے پالے ننھے ننھے نونہال
جھریاں جنکی جبیں پر دیکھیے فکرِ مآل

زندگی کی اُلجھنوں میں شوخ فطرت کو دبائے
کارخانے کی طرف جاتے ہیں اپنے سر جھکائے

نار سے افلاس کی پالی ہوئی زہرہ وشیں
جنکے پائے عصمت و عفت پہ حوریں بھی جھکیں

ہستیٔ بیکار کی اس کشمکش کے درمیاں
کسقدر مجبور ہیں اُنکی کھنکتی چوڑیاں

کاوشِ پیہم نصیبِ صنفِ نازک الاماں
کاش اُڑ جائیں زمین و آسماں کی دھجیاں

شرم کر اے گردشِ ایام کچھ تو شرم کر
اپنی فطرت کے تقاضوں کو ذرا تو نرم کر

تیرے صبح و شام اس سانچے میں ڈھلتے ہیں تو حیف
تیرے سینے میں یہی ارماں مچلتے ہیں تو حیف

تو شناسائے غمِ محرومیٔ دل کیوں نہیں
تیری فطرت رازدارِ سوزِ محفل کیوں نہیں

کیا تجھے حاصل نہیں ہے اک نگاہِ امتیاز
کیا نہیں بخشا گیا دل کو ترے کیفِ گداز

ہاں مگر اے گردشِ ایام تجھ سے کیا گلہ
خود بشر نے کھو دیا ہے آدمی کا مرتبہ

اک طرف مزدور ہے اور اک طرف سرمایہ دار
بن گئی یہ حد فاصل آدمیت کا مزار

اے کہ دنیا میں لقب ہے تیرا مزدورِ حقیر
اے کہ تیری زندگی ہے کارخانوں کی اسیر

اے کہ تیرے دم سے ہیں آباد انساں کے مقام
اے کہ تیری بےحسی وجہ جمودِ انتظام

تجھ میں احساسِ تقاضائے بقا باقی نہیں
نوعِ انساں کیلئے تجھ میں وفا باقی نہیں

اُٹھ کہ روزِ زندگی مستور ہے زیرِ حجاب
منتظر ہیں تیری اک آواز کے سو انقلاب

نوچ ڈال اب اس بھیانک سے مسلسل خواب کو
اُٹھ بدل دے انتظامِ عالمِ اسباب کو

توڑ دے انساں کی ہر خود ساختہ حد توڑ دے
چھوڑ دے پابندیٔ رسمِ کہن کو چھوڑ دے

چاند کے ہر اک رگ و ریشہ میں دوڑا دے لہو
ہر ستارے میں بپا کر غلغلۂ ہاؤ ہو

اپنی آنکھوں کو لڑا دے مہرِ عالمتاب سے
ذرے ذرے کو بڑھا دے گوہرِ نایاب سے

چپے چپے پر بہا دے ندیاں فردوس زار
قطرہ قطرہ سے رواں کر زندگی کے آبشار

بے ثباتی کی نگاہوں میں جھلک اُٹھے ثبات
موت کی دشواریوں سے چھین لے عیشِ حیات

آئی ساڈورا ڈنکن

ISADORA DUNCAN

(از جناب مظہر عزیز صاحب ایم۔ اے۔ بی، اے (آنرز) ایل۔ ایل۔ بی)

ایک فن کار کبھی اپنے آپ کو اُس طرح نہیں دیکھ سکتا جس طرح عوام اپنے آپ کو محض جانداروں کی حیثیت سے (یعنی وہی جو بدقسمتی سے ہم سب ہوتے ہیں!) دیکھ سکتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فن کار کی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں ———— ایک تو اُس کی وہ روزمرّہ کی شخصیت جو بہ حیثیت ایک جاندار کے دُنیا کے سامنے آتی ہے اور دوسری اُس کی وہ پوشیدہ شخصیت جو صرف اُس کے تخیّل ہی میں موجود ہوتی ہے اور دُنیا پر اگر اثر ڈال سکتی ہے تو صرف اپنے فن کے ذریعہ سے اثر ڈالتی ہے۔

اُس شدید جذبہ انفرادیت کے سبب (جس کے بغیر فن کار فن کار نہ ہو سکتا) فن کار کی یہ پوشیدہ شخصیت اُس کی اُمیدوں، ارمانوں اور" اپنے متعلق اُس کے تصوّرات" کا آئینہ ہوتی ہے۔ یہ وہ شخصیت ہوتی ہے جس میں وُہ ہمہ تن منہمک ہوتا ہے۔ اِس وجہ سے وہ کبھی ناقابل یقین، بعید از قیاس اور کبھی کبھی وحشیانہ سخنی کے ساتھ رسوم و قیود کا مخالف ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی عام طور پر وہ خود اپنے رویہ سے مطمئن رہتا ہے اور اس میں کم از کم اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ دھوکا دینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ فن کاروں کے اِس خبط کا کوئی علاج نہیں؛ اور ایسے تخلیقی فن کار بہت کم ہیں جنھوں نے "آئی ساڈورا" سے زیادہ تیز اور تواتر کے ساتھ اپنی زندگی میں اِس خبط کی نمایش کی ہے۔

آئی ساڈورا ڈنکن کی خودنوشت سوانح عمری سے ایک صاف تصویر برآمد ہوتی ہے ———— نہ صرف ایک لاثانی فن کار کی تصویر (جس کا ذریعہ رقص تھا) بلکہ ایک بڑی زبردست، بیباک اور آزاد شخصیت رکھنے والی عورت کی تصویر، جس نے ذرا سی دیر کے لئے بھی کبھی اپنے آپ کو اس طرح نہ دیکھا جس طرح دوسرے اُسے دیکھتے تھے!

اُن کے خیال میں اُس کی معمولی سے معمولی حرکتیں بھی ایک خاص اہمیت رکھتی تھیں وہ نہایت بیباکی کے ساتھ اپنی جذباتی زندگی کے واقعات (جو چھپے ہوئے بے جان حروف میں کسی ذلیل کی مجنونانہ انشا پردازی کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں) صاف صاف بیان کرتی چلی جاتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ کوئی شخص عقلِ سلیم سے اتنا زیادہ بے بہرہ نہیں ہو سکتا کہ اِن واقعات میں سے کچھ کے تخئیلی عنصر کو نظرانداز کر دے۔ مگر فطرتِ انسانی کے طالب علم کے لئے یہ بہت زیادہ دلچسپی کا باعث ہے کہ "آئی ساڈورا" جیسی حسّاس اور باشعور عورت بھی اپنے متعلق حقیقت سے اتنی بے خبر ہو سکتی تھی۔

"آئی ساڈورا ڈنکن" آئرستانی (IRISH) اور اسکاچستانی (SCOTTISH) والدین کے اختلاط کا نتیجہ تھی اور اب سے تقریباً ۶۵ (پینسٹھ) سال پہلے سان فرانسسکو (SAN FRANSISCO) میں پیدا ہوئی تھی۔ اُس کی ماں نے اپنے شوہر سے طلاق حاصل کر لی تھی، جو اُس بیڈھنگے عنصر کا بانی معلوم ہوتا ہے جو اُس کی بیٹی کے عالی دماغ خبط کی شکل میں رونما ہوا۔ اُس کی زندگی کا آغاز مادی آرام و آسایش سے خالی تھا۔ اس کے بچپن میں کوئی خوش آیند خود فریبیاں نہ تھیں۔ خود اُسی کے قول کے مطابق پہلا سبق جو اُس نے اپنی ماں سے سیکھا وہ یہ تھا:—

"نہ کوئی سینٹ نکولس ہے نہ کوئی خدا۔ صرف تمھاری روح ہی تمھاری مدد کر سکتی ہے!"

اِس سبق اور اُس ناخوشی کے شدید احساس نے (جو اس کی ماں کو شادی کر کے ہوئی تھی) اُس کی اپنی طبیعت میں خوب جگہ پکڑی۔ شروع ہی سے وہ "آزادِ محبت" کے اصول کی دل و جان سے حامی تھی اور اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ایک زندہ ہستی ہے جسے بغیر کسی روک ٹوک کے اپنی استعداد کی حد تک زندگی کرنے کا حق حاصل ہے۔ اُس نے کسی سے شادی نہیں کی۔ اور اُس کے تعشقات قریب قریب لاتعداد تھے، لیکن اُس والہانہ بےساختگی اور خود رفتگی میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں جس کے ساتھ اُس نے ہر معاشقہ شروع کیا۔

شروع میں غربت کے کچھ دن گذارنے کے بعد اُس نے عالمگیر کامیابی حاصل کی ———— ایسی کامیابی جو اس سے پہلے یا اُس کے بعد شاید کسی اور رقاص کو حاصل نہیں ہوئی۔

سارے اسٹیج پر بھاری بھاری پردوں کے پس منظر کے ساتھ، وہ اپنی حرکات سے اُن جذبات کے معنی ادا کرتی تھی جو موسیقی اُس کے اندر برانگیختہ کرتی تھی۔ جہاں کہیں بھی وہ گئی، کامیابی نے اُس کے قدم چومے۔ اور جو دولت اُس نے پیدا کی اُس کا اندازہ مشکل ہے۔

لیکن گو یہ کامیابی بلاشک ایک بڑی حد تک اُس کے ذاتی کمال کا اعتراف تھی پھر بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُس کے لباس کی وضع قطع (یعنی جس لباس میں وُہ اپنے فن کو پیش کرتی تھی) اگر اس مقصد کے حصول کے لئے بلاواسطہ معاوِن نہ تھی تو کم از کم ایک رُکاوٹ بھی نہ تھی۔

اُس کا جسم خوبصورت تھا اور وُہ ہمیشہ شفاف "گاز" (GAUZE) میں ملبوس ہو کر رقصاں ہوتی تھی۔ مگر اُس کی کامیابی کا یہ جزو نہ تو کبھی دوسروں کی نظر چڑھا نہ خود اُس نے اس کا اعتراف کیا۔

اُس کے خیال میں اُس کا جسم ہی اُس کے "فن کا ذریعہ" تھا۔ روڈِن (RODIN) کے ساتھ اپنے ایک معاشقہ پر (جو بدقسمتی سے تکمیل تک نہ پہنچ سکا) محاکمہ کرتے ہوئے خود اُس نے نہایت موثر پیرایہ میں دُنیا کے لئے اپنے جسم کی قدر و قیمت کا اندازہ پیش کیا ہے اُس صورتِ حال کا (جو یقیناً اُمید افزا معلوم ہوتی تھی) یہ بالکل ہی ناقابلِ فہم انجام مِس ڈنکن کے نزدیک نہ صرف روڈِن ہی سے کھو جانے کا مرادف تھا۔ بلکہ عام طور پر تمام دُنیا کے لئے ایک عظیم حادثہ تھا۔ اِس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے وہ صاف صاف اِس خیال کا اظہار کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کہ ایسے دو بلند دماغوں کے اتحاد سے قریب قریب ہر چیز وقوع پذیر ہو جاتی، اور جو کچھ نہ ہو جاتا وہ کم تھا۔ وہ کہتی ہے :۔

"لاریب، فن اور نہ صرف فن بلکہ تمام زندگی اِس اتحاد سے بہتر ہو جاتی"

یہ طرزِ خیال رجائی سہی، مگر کسی معاشقہ میں پڑنے کے لئے حد درجہ موزوں ہے۔

مگر ایسی نا اُمیدیاں بہت کم تھیں اور یہ واضح کر دینا مِس ڈنکن کے ساتھ گویا انصاف کرنا ہے کہ اُس کے معاشقوں نے اُس کی زندگی اور فن پر خواہ کچھ بھی اثر ڈالا ہو، مگر وہ خود ہمیشہ تر و تازہ رہی اور بگڑنے نہیں پائی۔ اور اِس قسم کے واقعات کے متعلق اُس کے پریشان کُن مگر صاف صاف بیانات کو پڑھنے کے بعد اِس حقیقت پر شک کرنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔

ایک صفحہ پر بار بار ہم سے کسی آدمی کا تعارف کرایا جاتا ہے جس کو ہم فوراً اُس کی زندگی اور عشق کا واحد مرکز سمجھنے لگتے ہیں کیونکہ وہ اپنے مخصوص جوشیلے انداز بیان سے ہمیں باور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ مگر دوسرے ہی صفحہ پر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ "خوبیوں کا پُتلا" کبھی دُنیا میں تھا ہی نہیں۔ وہ آیا اور چلا گیا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں! اور مِس ڈنکن پھر یکبارگی اپنے آرٹ کی خاطر زندگی کرنے لگتی ہے۔ اور اُس کا یہ فنِ زندگی اُسے کہاں تک پہنچا دیتا ہے! یونانِ قدیم اپنے روایتی حُسن کے لگاؤ کے ساتھ اُس کے رگ و ریشہ میں سمایا ہوا تھا۔ اپنی فنی کامیابی کے منتہائے کمال پر جب وہ پہلے پہل یونان گئی تو محض ایک سیاح کی حیثیت سے نہیں گئی بلکہ ایک ایسے شخص کی طرح جو کوئی مذہبی رسم ادا کر رہا ہو۔ وہ ہم کو بتاتی ہے کہ اُس کی آرزو تھی کہ وہ یونان اُس طرح پہونچے جس طرح یُولی سیز (ULYSSES) پہونچا تھا۔ اور اُس نے وینس (VENICE) میں کشتی کرایہ پر لیتے ہوئے یونانی نژاد کشتی بان کو یہ بات ہر ممکن وضاحت سے سمجھائی۔ اور اُسے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت اور مایوسی ہوئی کہ اُس کشتی والے نے کبھی یُولیسیز کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ مگر اُس چھوٹے سے گاؤں کے باشندوں کے طرزِ عمل نے، جہاں وہ آخر کار پہونچی، اِس نا اُمیدی کی کافی تلافی کر دی ہوگی۔

یہ اہم سفر طے کرتے ہوئے اُس نے یونانِ قدیم کا لباس زیب تن کر لیا تھا اور ہمارے لئے یہ فرض کر لینا محض خیال آرائی نہ ہوگی کہ وہ اس لباس میں بہت بھلی لگتی ہوگی۔

جب وہ اُس رعنائی اور لطافت کے ساتھ، جو اُس علاقہ کی عورتیں شاذ و نادر ہی پیش کر سکتی تھیں، کنارے پر کودی اور دو زانو ہو کر زمین کو بوسہ دیا تو اُس کا بیان ہے کہ وہاں کے مقامی باشندوں نے اُس کی پذیرائی کی اور اُس کی اِس حرکت سے اتنے زیادہ متاثر ہوئے کہ وہ اُن کی ممنون ہوئی۔

خوبصورتی سے تاثر پذیری کے اِس مقامی اظہار سے اُس کی ہمت بڑھی اور اُس نے وہاں مضافات میں رقص کے لئے ایک ہیکل بنانے کا تہیہ کر لیا تا کہ اس میں یونانِ قدیم کی شان و شوکت از سرِ نو تازہ کی جائے اور پھر وہاں سے دنیا بھر میں ہر جگہ شائع کی جائے۔ اِس نے اِس معبد کی تعمیر کے کام کو فوراً ہاتھ میں لے لیا اور دُوسرا سال خوبصورت یونانی لڑکوں کی ایک جماعت تیار کرنے میں گذارا تا کہ وہ "کورس" کے طور پر معبد اور دیگر مقامات میں اُس کے رقص کے ہم آہنگ ہوں۔

وائنا (VIENNA) میں اِس جماعت کے ساتھ اس کا پہلا رقص بہت کامیاب رہا۔ مگر لڑکے (خواہ یونان کے ہوں یا کہیں اور کے) پھر لڑکے ٹھہرے! زیادہ عرصہ گذرنے نہیں پایا تھا کہ اُنھوں نے اُسے واقعی آفت میں ڈال دیا۔ اُن میں سے اکثر لڑکے ایتھنز (ATHENS) کے عقبی گلی کوچوں سے بھرتی کئے گئے تھے اور اُنھوں نے بہت جلد جان لیا کہ صرف دعاؤں کا گانا کسی صورت سے اُن کے جوشِ طبیعت کے قرار واقعی نکاس کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ وہ رات کے وقت اپنی جائے قیام کو کھڑکیوں کے راستہ سے چھوڑنے اور اُس کے بعد نہایت بے باکی اور رِند مزاجی کے ساتھ وائنا کے پست ترین مقامات میں اُودھم مچانے کے عادی تھے۔

آخر، ایک دن، ہوٹل کے ایک ملازم نے کسی بدعملی پر اُن میں سے ایک کو نکوہش کی تو اُس نے اُس غریب کے پیٹ میں ایک جیبی چاقو بھونک دیا۔ اس حادثہ کے بعد مس ڈنکن کو یقین ہو گیا کہ "جماعت" کا انتظام اُس کے بس کا نہیں اور اِس لئے اُس نے فوراً اُسے

خوب یاد رکھئے

ادیب ہر انگریزی مہینہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے۔ کسی صاحب کے پاس تیسری چوتھی تک نہ پہنچے تو فوراً اطلاع دیدیں ورنہ پھر ہمارے ہاں رسالہ نہیں رہے گا اور ہم دوبارہ نہ بھیج سکیں گے۔

منیجر رسالہ ادیب دہلی

منتشر کر دیا اور لڑکے یونان واپس چلے گئے۔

گذشتہ جنگِ عظیم کے چند سال قبل آئی سادُورا ڈنکن کی شہرت تمام دنیا میں پھیل چکی تھی، مگر جیسی زندگی کی بُھوکی اور اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں قسمت سے دست و گریباں ہونے پر آمادہ وہ تھی ——— اُس کے لئے کسی حزنیہ (ٹریجیڈی) سے دو چار ہونا از بس لازمی اور ناگزیر تھا۔ اُس کے تین بچے تھے جن پر بلاشک و شبہ وہ اپنی جان چھڑکتی تھی مگر وہ سب ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ کے اندر اندر ہی اُس سے لے لئے گئے دو تو فرانسیسی رویرا پر ایک نہانے کے حادثہ میں مرے اور تیسرا چند ہفتوں کا ہو کر مر گیا۔ ایسی جذباتی خصوصیت اور محبت کرنے کی ایسی بے پناہ طاقت رکھنے والی عورت کو (جیسی وہ تھی) اِس سے کتنا کچھ صدمہ پہنچا ہوگا۔ اِس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اُس کی بے عنوان اور طوفانی زندگی میں کسی وقت بھی اُس کا "حوصلۂ زندگی" اُس کے اتنا کام نہ آیا جتنا اس وقت۔ انتہائی حزن و ملال کے عالم میں وہ پھر اپنے فن میں مستغرق ہو گئی اور اُس کے خوبصورت جسم کی صحت پرور صلاحیتوں نے اُسے اُس اضمحلال سے بچا لیا جو اس کے لئے یقینی معلوم ہوتا تھا۔

وہ تھوڑے ہی عرصہ میں بالکل اچھی ہو گئی اور برلن میں ایک "مدرسۂ فنون" کی بنیاد ڈالنے اور اُس کے چلانے میں مصروف ہو گئی۔

مگر اب وہ ادھیڑ عمر کو پہونچ رہی تھی اور وہ جسمانی خصوصیات جنھوں نے اُسے پہلے اپنی تمام ضروریات کے لئے کافی روپیہ پیدا کرنے میں مدد دی تھی اب مرورِ ایام سے خراب ہو چلی تھیں۔ برلن اسکول کے مصارف اُس کی آمدنی سے کہیں زیادہ تھے۔ جب اِس صورتِ حال کی طرف اُس کی توجہ منعطف کرائی گئی تو اس کا رویّہ وہی تھا جو صرف اُسی کا ہو سکتا تھا۔ اِس مشکل کے بیان اور اس کے حل کو اُس کے الفاظ سے بہتر الفاظ میں پیش کرنا ناممکن ہے :۔

"مجھے کوئی کروڑپتی تلاش کرنا چاہئے" میں نے روزانہ، پہلے مذاق میں اور پھر سنجیدگی کے ساتھ، یہ الفاظ سینکڑوں مرتبہ دُھرائے۔ ایک صبح ایک غیر معمولی کامیاب رقص کے بعد، میں اپنے آئینہ کے سامنے "ڈریسنگ گاؤن" پہنے بیٹھی تھی کہ میری خادمہ میرے پاس ایک ملاقاتی کارڈ لائی جس پر ایک معروف نام لکھا ہوا تھا، اور اچانک میرے دماغ سے یہ نغمہ بلند ہوا: "یہ میرا کروڑپتی ہے! میں نے خادمہ سے کہا "بلاؤ"۔

خیر وہ آیا، اور اُس وقت سے لے کر مرتے دم تک آئی سا ڈورا اپنے آپے میں رہی۔

اُس نے اپنی زندگی کو "فن" اور "عشق" میں تقسیم کر دیا تھا۔ اور جب وہ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ اِن دونوں مشغلوں کے واسطے اُس کی طاقت آخر تک نہیں گھٹی تو ہمیں اِس پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

انجام

"کیا بیہودگی ہے" کہ ہمیشہ بس عشق اور بہار ہی کے گیت گاتے رہو! خزاں کے رنگ زیادہ شاندار اور طرح طرح کے ہوتے ہیں، اور خزاں کے لطف ہزار گنا زیادہ زبردست، خوفناک اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں ایک شرمیلا شکار تھی۔ پھر باخوس (BACCHUS۔ الٰہۃ الخمر) کی ایک زبردست پرستار بنی، مگر اب میں اپنے عاشق پر یوں محیط ہو جاتی ہوں جیسے سمندر ایک بہادر شناور پر ——— چاروں طرف سے گھیرتے ہوئے، بھنور میں چکر دیتے ہوئے، بادل اور آگ کی لہروں میں لپیٹے ہوئے!"

اُس کا محبوب بننا، خواہ وہ کسی وقت ہوتا، بے شک ایک ناقابلِ فراموش تجربہ ہوتا ہوگا مگر ١٩٢٧ء میں، اس کے چند ہی مہینے بعد جب اُس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں وہ الفاظ لکھے تھے جنہوں نے، نفیری کی صدا کے مانند، یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اب بھی ہر اُس چیز کو جو زندگی پیش کر سکتی ہے اپنی گرفت میں لانے اور اُس سے لطف اندوز ہونے پر آمادہ ہے، خاتمہ آ پہنچا۔

ساحلِ رویرا پر موٹر چلاتے ہوئے ایک دن اُس کی ہوا میں اُڑتی اوڑھنی، جو اس کے گلے میں لپٹی تھی، پہیہ میں پھنس گئی اور وہ فوراً مر گئی ———

اچانک اور ڈرامائی اور سورج کی تیز روشنی میں، یہ ایسا انجام تھا جیسے شاید وہ خود بھی پسند کرتی۔

کلام آرزو

(حضرت آرزو لکھنوی)

اندھیرا دیکھنے میں تو زمیں سے آسماں تک ہے — نہ جانے غم کی یہ دُنیا کہاں سے ہے کہاں تک ہے
پتہ ہے سمتِ منزل کا نہ حد ہے طولِ منزل کی — وہاں تک کچھ نہیں، پھیلاؤ نظروں کا جہاں تک ہے
نتیجہ بھی تو کچھ پیش آئے میٹھی میٹھی باتوں کا — دل اس سے ہوگا کیا آسودہ جو لذت زباں تک ہے
اثر صحبت کا برحق اور صحبت ایسے دشمن کی — ڈر اُس نالے سے بھی جس کی رسائی آکان تک ہے
فضا ہے سونی دنیا کی جسے کہتے ہیں یکسوئی — خروش و جوش جتنا بھی ہے رسم امتحاں تک ہے
ہوس جب تک نہ مٹ جائے لگے کیا جی کا تھل بیڑا — کہ جتنا زور ہے طوفان کا اِس بادباں تک ہے
یہ ہمت کر کے پوچھے کون آزادی کے دشمن سے — قفس بھی ہے نظر میں یا عداوت آسماں تک ہے
ہر اک ذرّہ میں آنکھیں دیکھتیں ہیں حُسن کی دُنیا — خدا جانے ترے جلووں کی پاشانی کہاں تک ہے
علاقہ آرزو بزم ادب سے کیا رہا اس کو — اثر جس شورِ بے ہنگام کا گوشِ گراں تک ہے

حضرتِ ذوق کے ایک قصیدہ کی شرح

(از جناب فیض جھنجھانوی و نواب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی)

نام کو اشیا میں نے تلخی رہی نے سمیت (۹) بن گئی تریاک افیوں زہر میٹھا ہو گیا

لغت۔

اشیا۔ جمع شے۔ بمعنی چیز۔

سمیت۔ سم بمعنی زہر۔ سمیت زہریلا پن۔

تریاک۔ یا تریاق۔ معجون کی شکل کی مرکب دوا، جو چند ادویہ کو شہد میں ملا کر بنائی جاتی ہے اور تمام نباتی اور حیوانی زہروں کا علاج تصور کی جاتی ہے۔ نیز زہر مہرہ۔

حل۔

اب چیزوں میں کڑواہٹ اور زہریلے خواص نام کو باقی نہیں۔ حتیٰ کہ افیون جو زہر ہے اب تریاک یعنی فادزہر ہو گئی، اور زہر جس کو عام طور پر تلخ مانا گیا ہے۔ (مثلاً فلاں چیز کڑوی زہر ہے) اب میٹھا ہو گیا ہے۔

یہاں دو باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں، اول تو یہ کہ افیونی افیون کو تریاک کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ قدرت نے اکثر و بیشتر مہلک اشیاء کو تلخ بنایا ہے، تاکہ انسان فطرتاً ان سے احتراز کرے۔

کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم (۱۰) کیا عجب گر آبِ حنظل دیوے شربت کا مزا

لغت۔

جدوار۔ ایک درخت کی جڑ ہے۔ جو محلل اورام اور تریاق سمجھی جاتی ہے۔ اس کو ہندی میں نرکسی کہتے ہیں۔

زقوم۔ عربی لفظ ہے بتشدید قاف۔ مگر اہلِ ایران بتخفیف قاف استعمال کرتے ہیں۔ کڑوا اور زہریلا درخت ہے۔ اس کے برگ و شاخ کو اگر توڑیں تو دودھ سا نکلتا ہے۔ یہ خوراکِ دوزخیاں ہے۔ ہندی میں اسے تھوہر کہتے ہیں۔ نیز اہلِ عرب کا ایک کھانا جو کھجور اور مسکے سے تیار کیا جاتا ہے۔ یہاں معنی اول مراد ہیں۔

حنظل۔ خربزہ سے چھوٹا نہایت تلخ پھل ہے۔ ہندی میں اندرائن کہتے ہیں۔

حل۔

اب جبکہ بوجہ اعتدال آب و ہوا افیون تریاک اور زہر میٹھا ہو گیا تو کیا عجب کہ زقوم جو کڑوا اور زہریلا ہوتا ہے، جدوار ہو جائے جو مختلف امراض سوداوی کا علاج اور تریاق ہے۔ نیز اندرائن کا عرق جو از حد تلخ ہوتا ہے، شربت کا مزا دینے لگے۔

نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں (۱۱) کام میں افعی کے مہرہ ہو بجائے آبلہ

لغت

نیش۔ ڈنک۔ نیز نوکدار اور لمبے دانت، جیسے سور کے منہ کے دونوں جانب نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔

نوش۔ شیریں۔ گوارا۔ آبِ حیات۔ تریاق۔ شہد۔

دنبالہ۔ جسم کا وہ پچھلا حصہ جو دم کی مانند ہو، چونکہ یہ مرکب ہے۔ "دُم و ''و'' حرف تشبیہ سے اور چہال دنبالہ بمعنی عقب آئے، وہاں ''ہ'' زائد تصور کی جائے گی۔

زنبور۔ بھڑ۔ ایک قسم کا پیکان۔ نیز چھوٹی توپ، اسے زنبورک بھی کہتے ہیں۔ عام طور پر اونٹ پر رکھی جاتی ہے۔

کام۔ مراد۔ مقصود۔ و تالو اور حلق۔ اور یہاں آخر الذکر ہی سے مراد ہے۔ ہندی میں کام کے معنی کار کے ہیں، اور قرین قیاس یہ ہے کہ یہ معنی اول الذکر معنی سے لئے گئے ہیں۔ نیز ہندی میں اس کے معنی شہوت اور جماع کے ہیں۔ لہٰذا کام دیو۔ بمعنی نفس امارہ۔

افعی۔ سانپ کی ایک قسم ہے، نہایت زہریلی مشہور ہے اور شعراء نے باندھا ہے کہ وہ زمرد کو دیکھتے ہی اندھا ہو جاتا ہے۔ لیکن مشاہدہ کے خلاف ہے۔

مہرہ۔ ایک پتھر ہے جو تمام زہروں کا علاج سمجھا جاتا ہے۔

حل

جب دنیا میں اس قدر خوش آئندہ انقلاب پیدا ہو گیا کہ زہر تریاک اور تلخ چیزیں شیریں ہو گئیں تو کیا بعید ہے اگر بھڑ کی دم میں بجائے نیش کے جو تکلیف دہ ہے آبِ حیات اور شہد ہو جائے جو لذیذ اور خوش گوار ہے، اور سانپ کے منہ میں بجائے زہریلے آبلہ کے مہرہ پیدا ہو جائے جو فاد زہر ہے۔ آبلہ اور مہرہ صورت میں بہت کچھ مشابہ ہوتے ہیں۔ نیز نوش اور نیش میں صنعت تجنیس ہے۔

راحت و آرام کا اس دور میں ہو دور دور (۱۲) چاہیئے واقف نہ ہو دورانِ سر سے آسیا

لغت۔

دور۔ زمانہ۔ دور کے لغوی و اصلی معنی گھومنے کے ہیں۔ چونکہ زمانہ بھی چکر میں رہتا ہے اس لئے دور کہلایا۔

دور دور۔ غلبہ۔ حکومت۔ فی زمانہ دور دورہ بولا جاتا ہے۔ ممکن ہے حضرت ذوق کے دور میں دور دور مستعمل ہو۔

آسیا۔ یا آس۔ بمعنی چکی۔ آسمان اسی سے بنا ہے۔ یعنی چکی کی مانند گھومنے والا۔

حل۔ موجودہ زمانہ میں آسائش کا اس درجہ دور دورہ ہے کہ چکی جو ہمہ وقت چکر کھاتی رہتی ہے باوجود اس گردشِ مدام کے اس کا بھی سر نہیں چکرانا چاہیئے۔

موتیا بند اپنی آنکھوں میں جو رکھتی تھی صدف (۱۳) اب رکھے ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا

لغت

موتیا بند۔ وہ پانی جو آنکھوں میں اُتر آتا ہے۔ غلیظ ہو کر موتی کی شکل اختیار کرتا اور بینائی کو زائل کر دیتا ہے۔ اسے نزول الماء بھی کہتے ہیں۔

صدف۔ سیپی۔ آنکھ سے مشابہ ہوتی ہے۔ نیز چھوٹا جام شراب۔ اصطلاح نجوم میں ان تین ستاروں کو کہتے ہیں جو قطب کے گرد مثلث کی شکل میں ہیں۔ اس شکل کو صدف قطب بھی کہتے ہیں اور یہاں ہمارے نزدیک ذوق نے صدف کے آخری معنی یعنی صدف قطب کے لئے ہیں، اور قطب موتیا بند کے مترادف چونکہ صدف کے درمیان ہوتا ہے۔

اہلِ صفا۔ صاف باطن۔ روشن ضمیر۔

حل۔

اگر ہم اس شعر میں صدف کے معنی سیپی کے لیتے ہیں تو موتیا بند کے لئے تاویل کرنی ہوگی مثلاً سیپی کے بیچ کے اس حصہ کو موتیا بند قرار دینا ہوگا۔ جو قدرے کھردرا اور غیر شفاف ہوتا ہے۔ یا ابر نیساں کے اس قطرہ کو موتیا بند تصور کریں گے جو سیپی میں پڑ کر موتی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ نیز اگر صدف کے معنی ان تین ستاروں کے لیں تو قطب موتیا بند تسلیم کیا جائیگا، بات یہ ہے کہ عام طور پر سیپی کے بیچ میں کوئی چیز نہیں ہوتی جس کو موتیا بند قرار دیا جائے، اس کے لئے ہم کو کچھ اپنی طرف سے اضافہ کرنا ہوگا۔ اور صدفِ قطب میں قطب موتیا بند کی جگہ موجود ہے۔ بہرکیف معنی دونوں لے جا سکتے ہیں اور یہی کمالِ شاعری ہے۔

آگیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج (۱۴) تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا

لغت۔

زبان خامہ۔ اضافت بیانیہ۔ قلم سے مراد ہے۔

حل۔

اس زمانہ میں دوا عام طور پر پی جاتی تھی اور اس کا تعلق زبان و دہان سے تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ مریض کی زبان یا اس کے کام و دہن دوا سے کیا آشنا ہوں سرے سے نسخہ ہی لکھے جانے بند ہو گئے ہیں۔ نہ کوئی بیمار ہوتا ہے، نہ دوا لکھی جاتی ہے۔

نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہوالشافی طبیب (۱۵) کہتا ہے بیمار بس کر مجھکو ہے بالکل شفا

لغت

ہوالشافی۔ مرکب ہے، "ہو" اور "شافی" سے۔ "ہو" ضمیر ہے، نیز نام ہے ذات باری کا۔ اور "شافی" "شفا" کا اسم فاعل۔ مطلب ہوا، اللہ شفا دینے والا ہے۔ یہ کلمہ بطور برکت یا بطور اظہار عاجزی لکھا جاتا ہے۔ نیز نسخہ کے کاغذ پر سب سے پہلے یہی لکھا جاتا ہے۔

حل۔

شاعر کہتا ہے کہ بیمار اس تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں کہ طبیب نسخہ کے کاغذ پر صرف "ہوالشافی" لکھنے پاتا ہے کہ مریض تندرست ہو جاتا ہے اور نسخہ لکھنے سے روک دیتا ہے۔

فرق جا ہا یا ہنگ اعضائے بدن درد نے (۱۶) درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہیں سب سے جدا

لغت

فرق۔ دوری۔ جدائی۔ علیحدگی اور سر۔ نیز مانگ چونکہ بال جدا کر کے نکالی جاتی ہے۔ فِرَق۔ بکسر فا۔ و فتح را فرقہ کی جمع ہے۔

حل۔

لفظ درد دنیا کی ہر شے سے اس درجہ دُور ہو گیا ہے کہ اعضا تو درکنار اور اعضا تک رسائی تو کیسی اس کے اپنے حرف ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں۔ لفظ درد کی یہ خصوصیت خواجہ میر دردؔ نے بھی اپنے کلام میں ظاہر کی ہے۔

فرق بمعنی سر، اور اعضائے بدن کا ساتھ آنا، مراعاۃ النظیر۔

لاغروں کو ہے کمالِ تاب و طاقت یہ شتاب (۱۷) کیسے دو ہفتہ ہلال اک شب میں ہو بدرالدجےٰ

لغت

لاغر۔ بفتح غین۔ کمزور، دبلا پتلا، ناتوان۔

تاب۔ طاقت۔ ناتوانائی۔ روشنی۔ چمک۔ پیچ۔ گرمی۔ اس لفظ کی یہ خصوصیت ہے کہ جس کے ساتھ استعمال ہو اس کا مرادف بن جاتا ہے۔ مثلاً۔ تاب و طاقت۔ پیچ و تاب۔ آب و تاب۔ تپ و تاب۔ تگ و تاب وغیرہ۔

شتاب۔ جلد

ہلال۔ تیسری رات تک کے چاند کو کہتے ہیں۔ ہَلَل سے مشتق ہے جس کے معنی کمزوری، ناتوانی اور لاغری کے ہیں۔ چونکہ یہ بھی باریک ہونے کی وجہ سے لاغر و ناتواں معلوم ہوتا ہے، ہلال کہلایا۔

بدرالدجےٰ۔ چودھویں کا چاند۔ بدر معنی پورا چاند۔ دجا معنی اندھیرا۔ یہ لفظ عام طور پر سرورِ دو عالم خاتم النبیین کے واسطے استعمال ہوتا ہے، چونکہ عرب پر نیز دنیا پر تاریکی چھائی ہوئی تھی، جب یہ ماہِ کامل طلوع ہوا۔

حل۔

جب کمزور لاغر اور ناتوانوں کو اس قدر جلد طاقت آجائے اور کمزوری دور ہو جائے تو پھر دو ہفتہ کیسے، ہلال بھی ایک رات میں بدر بن سکتا ہے۔

مسلمانوں کا روشن مستقبل

(تیسرا ایڈیشن۔ مع ترمیم و اضافہ)

صرف مکتبہ جامعہ مہیا کر سکتا ہے

یہ مسلمانوں کی گذشتہ تین سو سال کی مذہبی، اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ ہے۔ مصنف نے ابتدا میں دس بنیادی حقوق کو اس طرح تفصیل کیساتھ بیان کیا ہے کہ ہر دور کی مالی، تعلیمی اور سیاسی حالت بالکل واضح ہو گئی ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اسمیں مصنف نے مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی پر ایسا مواد جمع کیا ہے کہ اُسے پیش نظر رکھکر ہماری یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور قوم کے نوجوان مزید تحقیقات کر سکتے ہیں اور مسلمانوں کیلئے مفید معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ مصنف کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی بدحالی نہ سلطنت کے چھن جانے سے ہوئی اور نہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے، بلکہ جدید تعلیم کے دور نے کچھ ایسے اسباب پیدا کر دئے ہیں کہ جن کا اثر مسلمانوں پر افسردگی اور سرد مہری کی شکل میں ظاہر ہے، اور اُن کے قوائے عمل مضمحل ہو گئے۔ اس قسم کے مایوس کن خیالات کو مصنف نے دور کیا ہے اور بتلایا ہے کہ ترقی کی دوڑ میں مسلمان کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ مصنف کی نظر ثانی اور جدید اضافوں کے بعد تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ (عہ)

مکتبہ جامعہ، قرول باغ، نئی دہلی

شاخیں اور ایجنسیاں ملے مکتبہ جامعہ جامع مسجد دہلی ملے مکتبہ جامعہ، امین آباد لکھنؤ ملے مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳ ۔ ملے کتب خانہ عابد شاپ حیدرآباد دکن ملے سرحد بک ایجنسی، بازار قصہ خوانی، پشاور

رہبرانِ سالوس

(از جناب کامل رشید)

وہ ایک زاہدِ عزلت پسند نیک اطوار ہمیشہ صرفِ عبادت تھی جسکی صبح و شام
ضرورتاً جو گیا سوئے شہر اک دن وہ تو دیکھا اُس نے جلوسِ شہی کو محوِ خرام
لگا پلٹنے یہ ہنگامہ دیکھکر زاہد نظر میں ہیچ تھا اُس کی یہ اہتمام تمام
نگاہِ خسروی اُس پر مگر پڑی ناگاہ قریبِ شاہ بلایا گیا بصد اکرام
یہ پُوچھا اس سے بانداز لطفِ شاہانہ یہ بات کیا ہے بتا اے مجاہدِ اسلام
ان اہلِ دہر سے کیوں دُور بھاگتا ہی تو سنا تا کیوں نہیں انکو خدا کے تو احکام
کہا یہ زاہدِ خلوت پرست نے سن کر سُناؤں کیا میں تجھے اے شہِ بلند مقام
عجب طرح کی ہی کچھ میری قوم کی حالت عجب طرح سے ہی برہم مرا جہانِ نظام
کہ ہاؤ ہو مرے میخانہ کی وہ اب نہ رہی نہ ساقی ہی نہ صراحی نہ خم ہے اور نہ تو جام
زبانِ خام اسے یا میں بد دعا سمجھوں کہ بھیک مانگے سے ملتا نہیں مجھے انعام
کبھی بیاں جو کروں اپنا میں یہ حالِ قال تو سمجھا جائے وہ بیہودہ، لغو اور دشنام
کبھی جو سامنے دیباچۂ الم رکھوں تو سمجھا جائے وہ اک جنگ اور جدل کا پیام
کبھی دکھاؤں اگر شرحِ زندگی اپنی تو سمجھی جائے وہ اک تیز دھار کی صمصام
کبھی بیاں جو کروں داستانِ غم اپنی تو سمجھی جائے وہ دوزخ کی بھٹیوں کا قوام

کبھی جو چاہوں کہ اس جنگ سی میں پھر جاؤں تو روندنے کو ہے تیار ابلقِ ایام
کبھی خیال جو کرتا ہوں میں کہ آگے بڑھوں تو کھینچی جاتی ہی پیچھے سی خاردار زمام
غلام کے لئے بس اک غلام گردش ہی اسی کے گرد ہی پھرنا کہ گردشِ ایام
نہیں ہے خونِ جگر پینے کی بھی اب طاقت مگر میں اپنے لئے خود ہی ہو گیا ہوں حرام

جہاں میں عیش کسے کہتے ہیں نشاط ہے کیا؟
سمجھ میں آتا نہیں وجہ انحطاط ہے کیا؟

یہ سُن کے کہنے لگا والیٔ سریر و کلاہ! تمہاری قوم میں کچھ ایسی ہستیاں بھی ہیں
کہ جن کی دوڑ میں پیچھے ہی اشہبِ شدّاد حرام کاری بھی ہی مے پرستیاں بھی ہیں
جہاں کہ بحرِ شقاوت کا مدّ ہی گرم ستیز تمہارے دوش پہ کچھ ایسی ہستیاں بھی ہیں
تمہاری قوم کے رہبر ہیں مولوی ملّا! یہ جن کی نیچی نگاہوں میں مستیاں بھی ہیں
یہ خانقاہوں میں اور مسجدوں کے حجروں میں خدا پرستی بھی ہی زن پرستیاں بھی ہیں
یہ پنجگانہ عبادت پہ باوضو سجدے گناہ کاریاں ہیں چیرہ دستیاں بھی ہیں
علاوہ اسکے وہ کچھ اور جانتے ہی نہیں کہ اس نمودِ بلندی میں پستیاں بھی ہیں

تمہاری قوم کے ہے رہبروں کی یہ حالت
پھر اُس پہ چاہتے ہو جاہ و دولت و حشمت
سُدھارو اِن کو نہیں تم سدھر نہیں سکتے
بغیر اس کے کبھی تم اُبھر نہیں سکتے

Taj Tahir Foundation